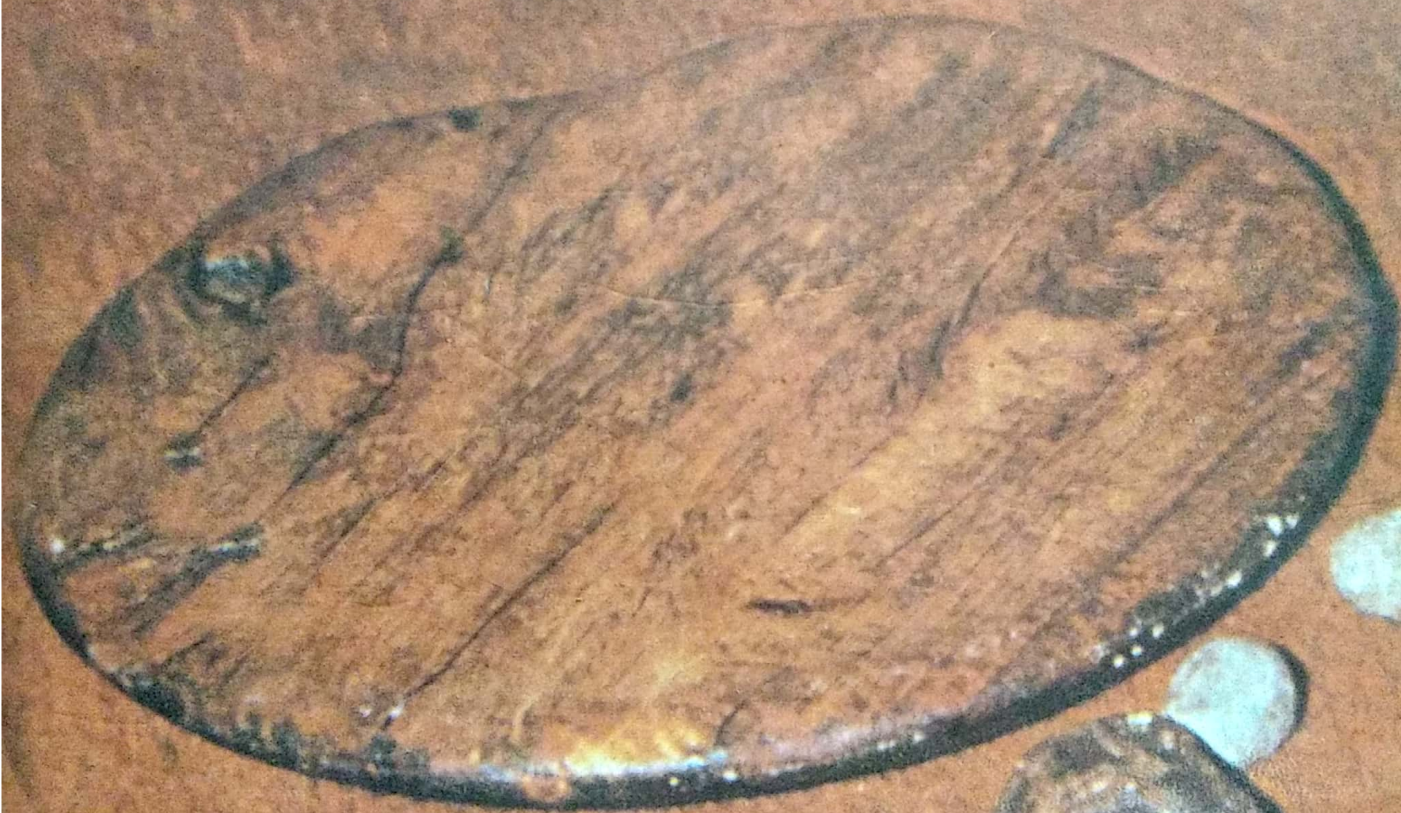
کلامِ بابا فرید شکر گنجؒ



روٹی میری کاٹھ کی لاوَن میری بھُکھ

Scanned with CamScanner

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب	کلام بابا فریدؒ شکر گنج (پنجابی)
مصنف	حضرت فریدالدین مسعود گنج شکرؒ
مرتب	پروفیسر ڈاکٹر سید نذیر احمد مرحوم
کتابت	شیر زمان
تزئین و زیبائش	محمود حسن رومی
صفحات	۱۵۲
پہلا ایڈیشن	۱۹۸۴ء
دوسرا ایڈیشن (تصحیح شدہ)	۲۰۰۶ء
تعداد	۱۰۰۰
مطبوعہ	لائن پریس، ہسپتال روڈ، لاہور
ناشرین	پیکیجز لمیٹڈ، لاہور، پاکستان

اِنتساب

میں کلامِ بابا فریدؒ کی اس تالیف کو
اپنے رفیقِ قدیم
سردار ہرچرن سنگھ براڑ
کی ذاتِ گرامی
جن کی دوستی میرے لیے وجۂ عزت و افتخار ہے
اور
اپنے مرحوم اُستاد
چوہدری شہباز خان
کے نام
جنھوں نے ہمارے ایچیسن کالج کے زمانۂ طالب علمی میں
پہلی مرتبہ مجھے اور سردار ہرچرن سنگھ کو
حضرت بابا فریدؒ کے کلام سے شناسا کیا،
نامزد کرتا ہوں

سید بابر علی

فہرست مضامین

تعارف

جس مِلّت ابراہیمی میں ہم منسلک ہیں اس کی روایات بنی اسرائیل کے انبیا اور ان کے صحیفوں کے ایک طویل سلسلے سے ہم تک پہنچی ہیں۔ بعض ان میں وہ ہیں جہاں انسانی حیات اور درد و غم کو ایک ہی شے سمجھا گیا ہے اور جس سے نجات کے لیے بڑے بڑے استقامت والوں نے بھی موت کی آرزو کی ہے اور اسے اپنی طرف بلایا ہے۔

ایوب نبی، جن کا صبر ضرب المثل ہے، دکھوں کے امتحان میں مبتلا ہوئے تو انہوں نے اپنی زندگی پر ماتم کرتے ہوئے فریاد کی "وہ دِن مٹ ہی کیوں نہ گیا جس میں یہ خبر سنائی گئی: لو! ہمارے گھر لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اے کاش وہ رُوسیاہ دن سیاہ ہی رہتا؛ اے کاش اس میں روشنی کی کوئی کرن نہ پھوٹتی؛ اے کاش اُس پر خدا اپنی نظر نہ ڈالتا اور وہ عدم میں ناپید ہی رہتا!"

وہ مصلوبِ نبیِ عفت و رحمت، یسوع مسیح، فداہٗ رُوحی، جب یہود کی دشمنی سے دار پر کھینچے گئے تو رُوح کی سپردگی سے پہلے انہوں نے اپنے ایک ہی سہارا دینے والے سے اس طرح فریاد کی: "ایلی ایلی لما سبقتنی! اللہ، میرے اللہ، تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے!"

محمد رسول اللہ نے، لاکھوں درود اور سلام اُن پر ہوں، زمانۂ بعثت کی ابتدا میں، جب وہ کوہِ حرا پر یکہ و تنہا وحی کے انتظار میں ہوتے اور وہ نہ آتی تو کئی دفعہ غم و اضطراب کی شدت میں اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹی سے گرا کر موت کی آغوش میں آسودہ ہو جانا چاہتے۔ یہ اور بات کہ خدا کو ایسا منظور نہیں تھا۔

اسلام ہندوستان میں آیا تو درد و غم کی ان روایات سے ہم بھی آشنا ہوئے۔ ہم نے بھی جان لیا کہ غمِ حیات ایک دردِ لا دوا ہے جس کا علاج کہیں نہیں۔ تاہم درد پر فریاد تو کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہم بے زبان فریاد کے لیے لفظ کہاں سے لاتے؟ یہ فرید الدین مسعود گنجِ شکر تھے جنھوں نے پہلے پہل ہم اہلِ پنجاب کو اظہارِ درد کے لیے اپنی زبان عطا کی۔ اُن کی زبان سچی تھی کہ وہ ان کی ہمہ درد زندگی کا عکس تھی۔ جامِ زیست کے کرب و الم کی تلچھٹ نے انہیں تلخ کام کیا تو انہوں نے بھی ایوب نبی کی طرح آرزو کی کہ اے کاش مجھے ماں نہ جنتی اور میں اس دنیا میں نہ آتا؛

بے دیہہ نالا کپیّا بے گل کپھو چکّھ
پوّن نہ اِتّی ماملے سہاں نہ اِتّی دُکھ (۷۶)

بابا فرید اُس درد و غم کے شاعر ہیں جو باشعور زندگی کی گہری حقیقت ہے۔ درد و غم کی عالمگیری کو جس طرح انہوں نے بیان کیا ہے کوئی اور ان کے نزدیک نہیں پہنچتا۔ ان کے کلام میں جوانی اور مال و منصب کی ناپائیداری کا رنج و الم ہے، رفقائے زمانہ کی بے ہمتی کی شکایت ہے، بڑھاپے کی تکلیفوں کا ہَول ہے، دنیاوی دلچسپیوں کی مٹھاس کے کڑواہٹ میں بدل جانے پر تلخ نوائی ہے، عبادتوں اور ریاضتوں کی بے ثمری کا ماتم ہے، تقدیر کے آگے بندے کی بے بسی پر حسرت و یاس ہے؛ الغرض زندگی کا ہر لمحہ اور ہر پہلو انہیں رنج میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

لیکن ایک لمحۂ استثنا بھی کبھی یہاں نظر آ جاتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جس میں شب زندہ دار بندے کو اس کی عبادتوں کا صِلہ ملتا ہے اور افلاک سے آخر اس کے نالوں کا جواب آتا ہے۔ اس پر وہ حقیقت کشف ہوتی ہے جس میں درد و غم اور گُن اَوگن سبھی محو ہو جاتے ہیں:

پہلے پہرا پھُلڑا پھل بھی پچھّا رات
جو جاگن لہن سے سائیں کنوں دات (۱۱۲)

یا یہ وہ وقت ہوتا ہے جب منزلِ محبوب کی طرف چلتے ہوئے وفورِ شوق کا ایسا عالم طاری ہوتا ہے کہ اس میں غمِ زمانہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی؛

گلیئیں چکڑ دور گھر نال پیارے نیہہ
چلاں تاں بھجے کمبلی رہاں تاں ٹٹے نیہہ
بھجو سجو کمبلی ! اللہ ورسو مینہ!
جاءِ ملاں تنھاں سجناں تٹو ناہیں نیہہ (۲۵-۲۴)

اِن جہات سے باہر بابا فرید کی ساری کائنات درد وغم ہی کے تھپیڑے کھا رہی ہے :

ایہ تن لہریں گڈ تھیا سچے تیری آس ! (۱۲۵)

اِن موذوی تھپیڑوں کے اثر سے جو تلخ نوائی اُن کے کلام میں رچ بس گئی ہے وہ اتنی نمایاں ہے کہ گرو نانک سے گرو ارجن تک نے اسے یکساں محسوس کیا ہے اور اپنے جوابی کلام میں اسے اک گونہ توازن کی طرف لانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کلامِ فریدؒ پر مزید بحث سے پہلے شاید یہ بہتر ہو کہ اُن کی زندگی کے حالات یہاں مختصراً بیان کر دیئے جائیں۔

بابا فریدؒ کے حالاتِ زندگی

بابا فریدؒ کے دادا شعیب ایک علمی خاندان کے فرد اور کابل کے رہنے والے تھے۔ وہ بارھویں صدی کے اواخر میں، غالباً غوریوں کے کابل پر حملہ آور ہونے کی وجہ سے، ترکِ وطن کر کے قصور اور لاہور سے ہوتے ہوئے ملتان پہنچے اور پھر وہیں سکونت اختیار کر لی[1]۔

شعیب پنجاب میں وارد ہوئے تو غزنوی حکومت رُو بہ زوال تھی۔ تاہم اُس وقت بھی لاہور، مُلتان اور اُچ اسلامی علوم کے مرکز شمار ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حکومت نے شعیب کو اُن کی علمی فضیلت کے پیشِ نظر ملتان کا قاضی مقرر کر دیا، جہاں انہوں نے اُس کی ایک اضافی بستی کوٹھیوال میں سکونت اختیار کر لی۔ شعیب کے تین بیٹوں میں سے منجھلے جمال الدین سلیمان تھے جن کی شادی نزدیک ہی رہنے والے شیخ وجیہہ الدین خجندی کی بیٹی قرسوم سے کر دی گئی۔ فریدؒ انہی کے گھر ۱۱۷۳ء یا ۱۱۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ پیدائش پر اُن کا نام فرید الدین مسعود رکھا گیا۔ "گنجِ شکر" اُن کا لقب ہے، جو بعد میں مشہور ہوا۔

فریدؒ کی ابتدائی تعلیم و تربیت اُن کی والدہ قرسوم بی بی ہی نے کی، جو ایک نہایت دیندار خاتون تھیں۔ انہوں نے فریدؒ کو نماز روزے اور دوسری عبادات کا ایسا پابند بنا دیا کہ وہ نوجوانی ہی میں عابد و زاہد مشہور ہو گئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ تکمیلِ تعلیم کے لیے مُلتان میں مولانا منہاج الدین کے مدرسے میں داخل ہو گئے۔ یہاں ایک دن آپ مدرسے کے صحن میں معروفِ مطالعہ تھے کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، جو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلیفہ بزرگ تھے، وہاں وارد ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے سے ملے۔ اس پہلی ہی ملاقات میں فریدؒ حضرت بختیار کاکیؒ کی رُوحانی عظمت سے ایسے متاثر ہوئے کہ جب خواجہؒ دہلی چلنے لگے تو آپ اُن کے ہمراہ ہو لیے اور دہلی پہنچ کر (جو ۱۱۹۲ء سے مسلمانوں کے تسلط میں آ چکا تھا) ایک تقریب میں جہاں بہت سے مقامی مشائخ جمع تھے، اُن سے بیعت ہو گئے۔

حضرت خواجہ کاکیؒ نے فریدؒ کو اپنی خانقاہ ہی میں ایک حجرۂ سکونت کے لیے دے دیا جس میں آپ عبادت اور ریاضت میں مصروف رہتے اور گاہے گاہے اپنے مُرشد کے رُو برُو حاضر ہو کر اُن سے راہِ سلوک کے لیے ہدایات حاصل کرتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت خواجہ معین الدینؒ دہلی آئے تو وہ فریدؒ اور ان کی روحانی استعداد سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے خواجہ کاکیؒ سے فرمایا "بختیار تم نے ایک ایسے شہباز کو گرفتار کر رکھا ہے جس کا مقام سدرۃ المنتہیٰ سے بھی آگے ہے"!

عوامی روایتوں اور تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو شے فریدؒ کو دوسرے رہروانِ جادۂ سلوک سے ممیّز کرتی ہے وہ اُن کی انتہائی سخت ریاضتیں اور مجاہدے ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے

---

[1] بابا فرید کے اسلاف کے متعلق بیشتر کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ آپ کے دادا شعیب نے منگولوں کے کابل پر حملے کے باعث اپنا وطن چھوڑا تھا۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ منگولوں نے پہلی دفعہ چنگیز خاں کی قیادت میں تیرھویں صدی کے رُبعِ اوّل میں وسط ایشیا کے اسلامی ممالک پر یلغاریں کی تھیں، شعیب کا بارھویں صدی میں ترکِ وطن کرنا ان کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا باعث کچھ اور ہو گا۔

کہ آغازِ شباب سے لے کر بڑھاپے تک آپ نے سخت ریاضتیں کرنا کبھی ترک نہیں کیا۔ چلہ کشی اور رات رات بھر عبادات میں کھڑے رہنا، مستقل روزے رکھنا اور افطار پر بھی بہت تھوڑا کھانا اور محتاجوں کی دستگیری کے لیے اپنا آرام تج دینا آپ کا طریق رہا۔ ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک دفعہ بھوک کے اضطرار میں آپ نے کچھ کنکر اُٹھا کر منہ میں ڈال لیے جو شکر کی طرح میٹھے ہو گئے تھے۔ آپ نے اس کا ذکر اپنے مُرشد حضرت بختیار کاکیؒ سے کیا تو اُنھوں نے آپ کو "گنج شکر" کا لقب عنایت فرمایا جو آج تک آپ کے نام کے ساتھ بولا جاتا ہے بلکہ بہت سے لوگ تو آپ کا نام ہی گنجِ شکر سمجھتے ہیں۔ ایک اور روایت جو اکثر بیان کی جاتی ہے، یہ ہے کہ آپ نے اپنے مُرشد خواجہ کاکی کی ہدایت پر ایک دفعہ چلۂ معکوس کھینچا یعنی چالیس دن ایک ویرانے میں درخت سے اُلٹے لٹک کر رات رات بھر عبادت کی۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ کسی شاعر کے تجرباتِ زندگی اس کے اشعار میں براہِ راست مُنعکس ہوں، لیکن ہو سکتا ہے کہ فریدؒ کا یہ شعر ایسے ہی جاں گُسل چِلّوں کے متعلق ہو کیونکہ اس میں مذکورہ حالت، یعنی تلووں پر پرندوں کی ٹھونگیں سوائے اُلٹا لٹکنے کسی اور صورت میں نہیں پڑ سکتیں:

"تن سُکا، پنجر تھیا، تلیاں کھُونڈن کاگ
اجے سو ربّ نہ بَوہڑیو، دیکھ بندے دے بھاگ!" (۹۰)

اس طرح کے چلّے اور ریاضتیں اسلامی طریق تو نہیں ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی آپ کی ملاقات کے لیے ہندو جوگی بھی آ جایا کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی جوگی نے آپ کے سامنے اس قسم کی ریاضت کے فوائد بیان کیے ہوں اور آپ نے امتحان کی غرض سے اس پر عمل کر ڈالا ہو۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس نوع کے چلّے اور حبسِ دم وغیرہ کی ریاضتیں دینِ اسلام کا تو کوئی حصہ نہیں ہیں لیکن ان کے کچھ نتائج طبعی طور پر پیدا ہونے لگتے ہیں؛ شرع نہ اُن سے روکتی ہے نہ ان کی کوئی ترغیب دلاتی ہے۔ گوتم بدھ نے ایک مدت سخت ریاضتیں کیں اور پھر اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب بے فائدہ، بنجر اور بانجھ تھیں۔ اُس مزمّل اور مدثّر لقب نبی نے، لاکھوں درُود اور سلام ان پر ہوں، جو خود راتوں کو عبادت میں اتنا کھڑے رہتے کہ پاؤں سُوج سُوج جاتے، اپنے بعض صحابیوں کو لمبی نمازوں اور متواتر روزوں سے منع فرمایا اور کہا تم اس معاملے میں میری نقل نہ کرو کہ مجھے تو خدا کھلاتا پلاتا ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہر شخص کو سخت ریاضت نفع نہیں دیتی۔ البتہ وہ رہبر جو اپنے مُریدوں کی طبائع اور مخفی قوتوں کو پہچانتا ہو، انہیں اس راہ پر لگائے تو لگا بھی سکتا ہے۔ یہ بات نفسیات کے ماہر عام طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ اذیت انسان کے خفیہ قوا کو بیدار کرتی ہے۔ لیکن کون سے خفیہ قوا؟ کیا انسان ہوا میں اُڑنے لگتا ہے؟ کیا اُس کی بصیرت اتنی ترقی کر جاتی ہے کہ وہ دوسروں کے دِل کی بات جاننے لگتا ہے؟ کیا اسے براہِ راست خدا، بندے اور کائنات کے تعلق کا مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے؟ کیا اس کے دِل میں انسانیت کی محبت زیادہ ہو جاتی ہے؟ کیا اُس کی قوتِ ارادی درجۂ کمال کو چھُونے لگتی ہے؟ یا کچھ اور؟ افسوس ہے کہ ہمیں ریاضتوں اور تقشّف کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں اس لیے ہم اُن کے نتائج کے متعلق دوسروں کی رائے ہی بتا سکتے تھے اور واللہ اعلم بالصواب کہہ کر اس قضیے کو ختم کرتے ہیں۔

معلوم نہیں کہ فریدؒ کب تک اپنے مُرشد کی خدمت میں دہلی رہے۔ لیکن وہ اپنے پاس لوگوں کی بکثرت آمد و رفت سے تنگ آ گئے کیونکہ وہ اُن کی عبادت کی یکسُوئی میں خلل انداز ہونے لگ گئے تھے۔ چنانچہ آپ نے مرشد سے دہلی چھوڑ دینے کی اجازت چاہی جو انہیں بادِل ناخواستہ دے دی گئی۔ اُن کے روانہ ہونے سے پہلے مُرشد نے مُریدوں کے حلقے میں اِعلان کیا کہ میری وفات پر فریدؒ ہی میرے جانشین ہوں گے۔ (آگے چل کر جب فریدؒ اُن کی وفات پر دہلی پہنچے تھے تو قاضی حمیدالدین ناگوری نے مرحوم خواجہؒ کا عصا، نعلین اور خرقہ جو رُوحانی وراثت کا نشان ہوتے ہیں، انہیں سونپ دیئے تھے۔ پھر وہ کچھ عرصہ اپنے مُرشد کی گدی پر دہلی میں بیٹھے تھے لیکن وہاں اُمراء کی سازشوں اور پُرشور زندگی سے جلد ہی اُکتا کر واپس چلے آئے تھے)

دہلی سے رخصت ہو کر آپ ہانسی میں آن بسے جو اُن دنوں ایک چھاؤنی ہوتی تھی۔ آپ نے بارہ سال یا کچھ زیادہ مدت یہاں قیام فرمایا۔ لیکن جب خلقت یہاں بھی اُن کے گرد جمع ہونے لگی تو وہاں سے اُٹھ کر اپنے قدیم وطن ملتان آ گئے۔ لیکن شہروں کے لوگ آپ کو کہاں چھوڑتے تھے۔ یہاں بھی دہلی اور ہانسی جیسا حال ہونے لگا تو آپ نے اجودھن کے قریب، جسے آجکل پاک پتّن کہتے ہیں، ایک بے آباد جگہ اپنی سکونت کے لیے پسند کی اور اپنے اہلِ خانہ کی مدد سے یہاں پر ایک جماعت خانہ گارے اور کچّی اینٹوں سے تعمیر کیا۔ حرمِ کعبہ کی طرح اس عمارت کی بنیاد بھی نہایت بے سرو سامانی میں رکھی گئی اور اُسی کی طرح خدا نے اسے ایسی برکت دی کہ آج بھی وہ مرجعِ خلائق ہے۔

اجودھن جیسی جگہ پر بھی دُور و دراز کے علاقوں سے لوگ جوق در جوق آپ کے پاس کسبِ فیض کے لیے آنے لگے تو اِرد گرد کے مُلّاؤں اور اہلِ ظاہر کو آپ سے حسد پیدا ہُوا۔ انہوں نے

آپ کی ساکھ گرانے کے لیے آپ کے خلاف یہ کہہ کر فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کی کہ یہ شخص گاہے گاہے سماع اور رقص میں حصہ لیتا پایا گیا ہے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اسی طرح اُن کی طرف سے آپ کے قتل کی کوششیں بھی ناکام رہیں۔ آپ نے اِن دشمنوں سے کبھی بدلہ لینے کی کوشش نہیں کی بلکہ اُن کی طرف صلح ہی کا ہاتھ بڑھایا۔ ہو سکتا ہے کہ انہی حالات میں یہ شعر لکھا ہو :

جے تیں مارن مُکیاں تنھاں نہ ماریں گھُم

آپنے گھر جلیئے پیر تنھاں دے چُم (۲۷)

آپ کے جماعت خانے میں ہر خاص و عام کو آنے اور ٹھہرنے کی اجازت تھی حالانکہ آپ ہی کے بعض ہمعصر مشائخ مثلاً بہاؤالدین زکریا علیہ الرحمۃ صرف خاص خاص آدمیوں کو اپنے پاس ٹھہرنے کی اجازت دیتے تھے۔ فُقراء سے ملاقات کا ایک دستور یہ ہے کہ اُن کے پاس آنے والے لوگ کچھ نہ کچھ بطور نذرانہ یا ہدیہ انہیں پیش کرتے ہیں جنھیں "فتوحات" کہا جاتا ہے۔ بابا فریدؒ اِنھیں جماعت خانے میں آنے والوں کے کھانے پینے اور گِرد و نواح کے غریبوں اور مسکینوں کی حاجت روائی پر خرچ کر دیتے اور خود اپنے اہلِ خانہ سمیت بڑی تنگی سے بسر کرتے۔ آپ اکثر روزہ رکھتے اور افطار پر ڈیلوں اور دوسرے جنگلی پھلوں اور خشک روٹی ہی کو کافی سمجھتے اور دل کو یُوں تسلی دیتے :

رُکھی سُکھی کھائے کے ٹھنڈا پانی پی

دیکھ پرائی چوپڑی نہ ترساویں جی (۲۹)

آپ کی شاید دو یا تین بیویاں اور بہت سے پوتے پوتیاں تھیں جو آپ اُن سے بہت محبت رکھتے تھے لیکن آپ نے اُن کی آسودگی کی خاطر اپنے فقر اور توکل کو نہیں چھوڑا۔ باوجود فاقوں کی کمزوری اور عبادتوں کے شغف کے آپ دوسرے اکابر چشتیہ کی طرح سماع سے لذت گیر ہوتے، بلکہ بعض دفعہ تو آپ پر بے خودی کا عالَم ایسا طاری ہوتا کہ رقص بھی کرنے لگتے۔ چشتیہ کے سماع کو جائز قرار دینے سے اس کی شرعی ممانعت کی شِدت کا اثر کچھ کم ہوا تو ہندوستان کے موسیقاروں کا حوصلہ بڑھا۔ ان کے کئی گھرانے وجود میں آگئے جن کے جذبۂ مسابقت سے راگ میں ترقی کی رفتار تیز ہوئی اور "خیال" اور "قوالی" جیسے کئی اسلوبِ موسیقی ایجاد اور مروّج ہوئے۔

اس میں شک نہیں کہ سماع کی موسیقی سے شغف رکھنے کے علاوہ بابا فریدؒ شعر بھی کہتے تھے۔ آپ کے اشعار عربی، فارسی اور ہندوی میں موجود ہیں۔ فارسی کے دو شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ ایک غالباً مُریدوں کی تنبیہہ و اصلاح کے لیے ہے اور دوسرا رُومانی کیفیت کا مظہر ہے۔

مُریدوں کو بادشاہوں اور امیروں سے پرے رہنے کی تاکید کرتے ہوئے آپ کہتے ہیں کہ اگر اُن سے ملنے ملانے کی خواہش رکھو گے تو اپنے آپ سے مہجور رہو گے یعنی خودشناسی سے محروم ہو جاؤ گے :

"گر وصالِ شاہ می داری طمع

از وصالِ خویشتن مہجور باش"

آنسوؤں کا دوڑ کر کسی جانے والے کی آستین کو پکڑ لینا شاعرانہ تخیل کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ ملاحظہ ہو بابا فرید کی یہ رباعی :

دوشینہ شبم دلِ حزینم بگرفت

و اندیشۂ یارِ نازنینم بگرفت

گفتم بسرو دیدہ رَوَم بر درِ تو

اشکم بدوید و آستینم بگرفت

آپ کے ہندوی کلام میں سندھ سے ہند تک کی مقامی بولیوں کے لفظ ملتے ہیں۔ مولوی عبدالحق فریدؒ کے درجِ ذیل شعروں کو اُردو کے پہلے معلوم شعر قرار دیتے ہیں :

وقتِ صُبح وقتِ مُناجات ہے

خیز دراں وقت کہ برکات ہے

نفس مبادا کہ بگوید ترا

خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے

آپ کے کئی ہندوی شعر خالص پنجابی بولی اور لہجے میں ہیں اور ان کی تعداد باقی اشعار کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے بیشتر تو سکھوں کے مقدس آدگرنتھ میں شامل ہیں، لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو اس میں نہیں۔ یہ اشعار جنھیں شلوک کہا جاتا ہے چونکہ ہماری کتاب کا اصل موضوع ہیں، اس لیے اُن کی بحث آگے چل کر ایک الگ عنوان کے تحت کی جا رہی ہے۔

جماعت خانے میں کچھ ایسے فقرا بھی زیرِ تربیت رہے جن کا نام آج تک اسلامی دُنیا میں روشن ہے۔ ایک ان میں خواجہ نظام الدین اولیاؒ تھے جو کم عمری ہی میں اتنے علم و فضل والے شمار ہوتے تھے کہ ان کا آگے چل کر حکومت کے عمائد میں شامل ہونا متوقع تھا، لیکن انہوں نے بابا فریدؒ کے ساتھ فقر و فاقہ میں شریک ہونے کو ترجیح دی اور آخر کار آپ بابا کے جانشین مقرر ہوئے۔ حضرت امیر خسروؒ اور نصیر الدینؒ چراغ دہلی انھی کے مُریدتھے۔ بابا فریدؒ کے ایک اور خلیفہ علاؤالدین صابرؒ تھے جن کا مزار کلیر میں مرجعِ خلائق ہے۔

بابا فریدؒ اکثر حاجت مندوں کو ان کی حاجت روائی کے لیے تعویذ لکھ دیتے یا انھیں کسی آیت کا ورد کرنے کو کہتے۔ اکثر انھیں یہ تلقین بھی کرتے کہ راہ شریعت پر چلنا اور کسی کو اپنے ہاتھ یا زبان سے ایذا نہ دینا۔ عمر کے قریباً نوے سال گزر گئے اور بڑھاپے اور ریاضتوں نے جسم کو اور بھی لاغر اور کمزور کر دیا تو اُن کے دِل میں دنیا سے کُوچ کر جانے کا خیال زیادہ گھر کر گیا

اکھیں دیکھ پتینیاں سُن سُن رینے کن

ساکھ پکندی آئی آ، ہور کریندی وَن! (۱۱)

جیوں ساکھ پک کر رنگ بدلنے لگی۔ باباؒ کی آخری بیماری میں اُن کی عیادت کے لیے سید محمد کرمانی دہلی سے اجودھن پہنچے تو آپ نے اُن کے سامنے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور اپنا خرقہ، مصلےٰ اور عصا بطور نشانِ خلافت انھیں دیا کہ خواجہ کو پہنچادیں۔ اسے قدرت کا کرنا ہی کہنا چاہیے کہ یہ اُسی طرح ہوا جس طرح بہت سال قبل خواجہ بختیار کاکیؒ نے موت کے کنارے پہنچنے پر فریدؒ کی غیر حاضری میں اپنا خرقہ انہیں نشانِ خلافت کے طور پر بھجوایا تھا۔ اب خواجہ نظام الدینؒ حاضر نہیں اور بابا فریدؒ انہیں نشانِ خلافت بھجوا رہے ہیں۔

سن ہجری ۶۶۴ کی ۵ محرم تھی اور عیسوی سن ۱۲۶۵ کی ۱۷ اکتوبر کہ بابا فریدؒ نے اس دارالفنا سے عالمِ بقا کی جانب رحلت فرمائی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

کلامِ فریدؒ کی بعض خصوصیات

ان کے عربی فارسی اشعار سے قطع نظر کریں تو بابا فریدؒ کا باقی کلام ملتانی پنجابی میں ہے جو اپنی نرم اور میٹھے لہجے کی وجہ سے شعر کے لیے ایک خاص طور پر موزوں میڈیم ہے۔ جیسے ہم پہلے بھی کہہ آئے ہیں بابا فریدؒ کا بڑا موضوع باشعور زندگی کا المیہ ہے۔ شک نہیں کہ چند ایک جگہ انھوں نے اپنی عبادتوں میں کشفِ حقیقت کی اہتزاز آور کیفیتوں کا ذکر کیا ہے؛ بعض جگہ راہِ وفا میں اپنے پُر شوق اقدام کی بات کی ہے اور کہیں کہیں اخلاق آموزی بھی کر ڈالی ہے، لیکن سچ یہی ہے کہ وہ باشعور انسان کی حیات کے المیے کے شاعر ہیں۔ پھر زندگی المیہ ہے تو موت اس سے بھی بڑا المیہ ہے کہ موت میں نہ صرف حسن، جوانی، مال و جاہ اور اُن کا غرور بلکہ عقل و شعور کا چکا چوند کر دینے والا نُور اور احساسات و جذباتِ عالیہ بھی معدوم اور صفر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اسی لیے بابا فریدؒ کی حساس اور انسان دوست طبع نے انھی کو اپنا بڑا موضوع بنایا ہے۔ جن ذہنی تصویروں کی مدد سے وہ اپنے موضوع کو ہم تک پہنچاتے ہیں وہ پنجاب کی فضا کی خاص نمائندہ ہیں۔ وہ دریاؤں، اُن کی طغیانیوں، بے پناہ "ڈھاہوں"، بیڑیوں، ملّاحوں، بیلوں، جنگلوں، جنگلی پھلوں، جنگلی "ماکھیوں" اور ریگزاروں کے نقشے ہمارے سامنے لاتے ہیں اور ہم پہچاننے لگتے ہیں کہ ہزار سال پہلے بھی ہمارا یہ وطن کتنا پنجابی اور درد مند دِلوں کا پروردگار تھا۔

قطع نظر موضوعات کے، بابا کے پنجابی کلام کا طرزِ تکلم بڑا سوفسٹیکیٹڈ Sophisticated ہے جو ایک بڑا تعجب انگیز امر ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے قیاس چاہتا ہے کہ اُن سے پہلے پنجابی شاعری کی کوئی مضبوط روایت ضرور موجود ہوگی۔ لیکن تاریخ میں ہمیں کسی ایسے مکتبۂ شعر کا سُراغ نہیں ملتا۔ ہزار سال پہلے ناتھ جوگی پنجاب کے گاؤں گاؤں پھر کر اور اپنا اور دوسروں کا کلام گا گا کر خیرات حاصل کیا کرتے تھے لیکن ان کا کوئی نمونہ ہمارے سامنے نہیں کہ ہم بتا سکیں کہ یہ کلام کس معیار کا ہوتا تھا۔ پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بابا کے زمانے سے قبل

مسعود سعد سلمان نے پنجابی میں سی حرفیاں کہی تھیں۔ مگر اب وہ بھی ناپید ہیں۔ اس لیے ہمارے خیال میں یہ ناممکن نہیں کہ بابا پنجابی لکھتے وقت ہمعصر اور قدیم عربی فارسی شعر کے ظاہر و باطن سے متاثر ہوئے ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کئی جدید مغربی علوم و فنون سے واقف اُردو لکھنے والے، خواہ وہ شاعر نہ بھی ہوں، اپنی تحریر اور گفتگو میں ان علوم سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس لیے ناممکن نہیں کہ بابا کے پنجابی شعر کو عربی، فارسی کلاسیکی ادب کے بلند معیار نے راہ دکھائی ہو۔

گرنتھ صاحب میں بابا فریدؒ کا کلام شلوکوں اور شبدوں کی صُورت میں جمع ہے۔ شلوک عام طور پر دو مصرعوں کا ہوتا ہے (اگرچہ ان کی ایک قلیل تعداد یہاں تین چار چھ یا آٹھ مصرعوں کی بھی ہے) اور انھیں کسی خاص راگ کا پابند نہیں کیا گیا۔ شبد فریدؒ بھی چند ہی مصرعوں پر مشتمل ہیں لیکن انہیں یہاں آسا اور سُوہی راگ کے ماتحت درج کیا گیا ہے۔ بابا کے شلوکوں کی تعداد ۱۱۲ ہے لیکن ۱۸ شلوک جو گرُو نانک اور دوسرے گرُو صاحبان نے ان میں سے بعض کے جواب میں لکھے ہیں وہ بھی ان کے ہمراہ ہی درج کر دیے گئے ہیں تاکہ گرنتھ صاحب میں جو تشخص کسی شلوک کا نمبر کے حساب سے مقرر ہو چکا ہے وہ بگڑنے نہ پائے، ورنہ ہم شاید انھیں ردیف وار لکھتے۔ شلوکوں کا معیاری وزن اس مصرعے کے مطابق ہے: "روٹی میری کاٹھ کی لاوَن میری بھکھ" لیکن کچھ مصرعے مختلف "وزن" بھی رکھتے ہیں جس کی وجہ ہمیں سمجھ نہیں آئی، مثلاً یہ مصرعے:

بھے پئے تن کھیں ہوءِ لوبھ رت وچوں جاءِ
جیوں بَیسنتر دھات سُدھ ہوءِ
تیوں ہر کا بھو دُرمت مَیل گواء (۵۲)

ہو سکتا ہے کہ بعض لفظوں کا قدیم تلفظ استعمال کیا جائے تو اس سے غیر متوازن مصرعوں کو متوازن بنانے میں مدد ملے لیکن مشکل یہ ہے کہ قدیم تلفظ کسی کو معلوم نہیں۔ اس لیے ہم نے یہ قاری کی اپنی سمجھ پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ ایک معقول حد کے اندر الفاظ کے حروفِ علت کی اصوات کو لمبا یا مختصر کر کے یا ان کی تشدید سے کسی غیر موزوں مصرعے کو موزوں بنا لے۔ لیکن یہ بھی خیال ہے کہ گوردواروں میں یہ کلام گا کر باجوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ اس صورت میں وزن کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

بابا فریدؒ کا زمانہ آج سے آٹھ سو سال پہلے کا ہے، اس لیے اُن کا کلام بھی اُسی زمانے کی پنجابی میں ہے۔ اس قدیم زبان کے بہت سے لفظ آج اتنے غیر مانوس ہو چکے ہیں کہ عصرِ جدید کے کئی پنجابی بولنے والے انھیں سمجھ نہیں سکتے۔ مثلاً تھوڑے لوگ ہی جانتے ہوں گے کہ "دھن" کے معنی عورت اور "کڑی" کے معنی آواز یا صدا کے ہیں۔ دیکھیے کلامِ فریدؒ کا پہلا ہی شلوک:

جت دِہاڑے دھن وری ساہے لئے لکھاءِ ....
فریدا کڑی پوَندی ای کھڑا نہ آپ مہاء (۱)

قدیم اور جدید جُملوں میں گرامر کے فرق بھی نمایاں ہیں۔ افعال کی گردانیں کئی جگہ آجکل کے عام طریق سے خاصی مختلف طرز میں چلتی نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے شلوک ۴۸ کا یہ مصرع: "فریدا جے جاناں تِل تھوڑڑے سنمل بُک بھری"۔ آجکل کی زبان میں یہ مصرع یوں پڑھا جانا چاہیے: "فریدا جے جاناں تِل تھوڑڑے سنبھل بُک بھراں"۔ "جے جاناں" اور "بُک بھری" دونوں میں ماضی تمنائی کے فعل صیغہ واحد متکلم میں ہیں لیکن کتنی عجیب اور پریشان کرنے والی بات ہے کہ ایک جگہ فعل "آں" میں اور دوسری جگہ "ی" میں ختم ہوتا ہے۔

پھر ہمیں ایک شارح بتاتا ہے کہ "تِلوں سے بُک بھرنا" ایک رسم زمانۂ قدیم میں دُولہا دُلہن کے درمیان ہوتی تھی۔ ہمیں ڈھونڈنے پر بھی اس رسم کے کوئی آثار آجکل کے معاشرے میں نہیں ملے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شعروں کے معنی سمجھنے ممکن نہیں جن میں وہ رسمیں مذکور ہوں جنھیں عہدِ حاضر میں کوئی شخص جانتا ہی نہ ہو۔ عین ممکن ہے کہ بعض اور شلوکوں میں بھی ایسی رسموں کی طرف اشارہ ہو جنھیں لوگ اب بھُول چکے ہیں، اس لیے آج کے شارحین اُن سے بے خبر ہی گزر جائیں۔

شلوکوں کے الفاظ کی اِملا اور تلفظ

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے بابا فریدؒ کا بیشتر کلام ہمیں مقدس گرنتھ ہی سے ملا ہے جو گورمکھی رسم الخط میں تحریر ہوا ہے۔ پاکستان میں کم لوگ ہی اسے پڑھ سکتے ہوں گے۔ البتہ اب جو پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے پنجابی کی کلاس جاری ہوئی ہے اور اس کے طلبہ کو اس سے شناسا ہونا لائقِ تحسین قرار دیا گیا ہے تو اکثر اسے پڑھنے لگ گئے ہیں۔ گورمکھی میں لکھے ہوئے بعض لفظوں کا

تلفظ ہمارے لیے آسان نہیں۔ پھر اس تلفظ کے مطابق انھیں نستعلیق خط میں املا کرنا اور بھی مشکل ہے۔ اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہم نے "اشارات" میں ہر شلوک کو پہلے گورمکھی میں لکھا ہے۔ پھر اس کے مقابل اسے خطِ نسخ میں (جہاں تک وہ اصل گورمکھی تلفظ کی نقل کر سکتا ہے) منتقل کیا ہے۔ خطِ نسخ اگرچہ اب پاکستانی پنجاب میں ہر دلعزیز نہیں رہا لیکن اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کسی لفظ کے حرفوں کے جوڑ بہ نسبت نستعلیق کے زیادہ واضح ہوتے ہیں اور ان پر زیر زبر صحیح جگہ لگانی آسان ہوتی ہے۔ اس کے باوجود بعض لفظوں کا تلفظ عام اُردو خواں شخص سے مشکل ہی ادا ہوگا۔ مثال کے طور پر نہ ، جے اور جائے پنجابی کے عام لفظ ہیں، لیکن گرنتھ صاحب کی گورمکھی میں انھیں کی جگہ ن ، ج اور جاء لکھا گیا ہے جنھیں صحیح تلفظ کرنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ گورمکھی تلفظ کو اُردو خط میں منتقل کرنے کے شوق میں بعض لوگ کس حد تک چلے گئے ہیں، پاکستان لوک ورثے کے قومی ادارے کی کتاب "کے فریدؔ" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں "کُوْن سوئنیا" کو "ک وِنْ سُ منی آ" اور "تن ایویں جالیں" کو "تن اے دے جاے نِ ھ" املا کیا ہے!

ہمارے بہت سے قاری جانتے ہوں گے کہ گرنتھ صاحب کی گورمکھی میں ذ ز ژ ش ص ض ط ظ ع غ ف ق جیسی اصوات کے لیے حرف موجود نہیں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ بابا فریدؒ اپنی عام بول چال تک میں یہ اصوات برتتے ہوں گے اور یہ بھی ضرور ہے کہ بابا فریدؒ کے کلام کا جو متن شیخ ابراہیم (فریدؒ ثانی) نے بابا نانک کو دیا تھا اس میں یہ حروف استعمال ہوئے ہوں گے۔ اس لیے ہمارے بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ جب بابا فریدؒ کا کلام اُردو خط میں منتقل کیا جائے تو ہمیں اصل کی طرف لَوٹنا چاہیے اور گورمکھی تحریر و تلفظ کا لحاظ نہیں رکھنا چاہیے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہوگی۔ وہ اس لیے کہ عربی فارسی کے جو لفظ پنجابی میں استعمال ہوتے ہیں وہ پنجابی ہی ہو جاتے ہیں اور عام طور پر انھیں اسی طرح بولنا اور لکھنا چاہیے جس طرح وہ عوام میں مروج ہیں۔ لیکن پھر سوال ہوگا کونسے عوام؟ ہر یلینے سے پشاور اور ملتان تک کے عوام ایک ہی پنجابی لفظ کو کئی لہجوں میں بولتے ہیں؛ کسے معیار بنائیں؟ اگرچہ بابا فریدؒ کے ملتان کی "جم پل" ہونے کی وجہ سے کسی زیرِ نزاع لفظ کا ملتانی لہجہ باعثِ ترجیح ہوگا لیکن عملاً ہم نے یہ کیا ہے کہ اُن کتابوں پر ایک نظر ڈالی ہے جن میں بابا فریدؒ کا کلام اُردو حروف میں شائع ہوا ہے۔ ان کے مؤلف ہیں (۱) ڈاکٹر بچن سنگھ (۲) پروفیسر جیت سنگھ سیتل (۳) پروفیسر شریف کنجاہی (۴) محمد افضل خاں (۵) مُنیشی رام مشتاق چشتی (۶) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر اور (۷) پروفیسر محمد آصف خاں۔ ان میں سے پہلے تین مؤلفوں کی املا گورمکھی سے اور اگلے تین کی عوامی لہجے سے نزدیک تر ہے۔ محمد آصف خاں مقابلۃً اعتدال پسند ہیں اور اعراب لگانے میں بڑے محتاط ہیں۔ اس لیے ہم نے بیشتر اُنھی کے طریقِ تحریر کا تتبع کیا ہے۔ لیکن جہاں مناسب معلوم ہوا ہے اپنے خیال کے مطابق بھی املا کی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اس نقل نویسی کے لیے کوئی پکا اصول دریافت نہیں کر سکے۔ برنارڈشا نے کہا ہے کہ سنہرا اصول یہی ہے کہ سنہرا اصول کوئی نہیں۔ بس ہم نے ایک حد تک معصر قارئین کی پڑھنے کی سہولت کا خیال رکھا ہے۔ اس میں ایک طرح ہم قدیم گرو صاحبان کے پیرو کار بن گئے ہیں کہ انھوں نے بھی اپنے زمانے میں لوگوں کی آسانی کے لیے کلامِ بابا فریدؒ کو اس لہجے میں لکھا تھا جو عوام میں اس وقت مقبول تھا۔ ہم بھی اپنے عہد کے مروّج تلفظ، لہجے اور املا کو نعمت سمجھ کر برت رہے ہیں۔ یہ محض حسنِ اتفاق ہے کہ ہماری طرزِ املا وہی ہے جو آٹھ سو سال قبل بابا فرید کی تھی۔ اس صدی میں تعلیم کے عام ہونے سے پنجابی عوام تک میں بہت سے پنجابی الفاظ کا تلفظ فارسی عربی کی طرف مڑ گیا ہے۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بتایا جائے کہ بابا فریدؒ کا کلام سکھ گرنتھ میں کس طرح شامل ہوا۔ حضرت بابا نانک (۱۴۶۹ء سے ۱۵۳۸ء) کو صوفیانہ اور پند آموز کلام جمع کرنے کی بڑی لگن تھی۔ آپ اِن کی تلاش میں "عصا ہتھ کتاب کچھ" دُور دُور کے سفر کیا کرتے تھے۔ اسی غرض سے آپ پاکپتن کے گدی نشین شیخ ابراہیم یا فریدؒ ثانی (تاریخ گدی نشینی ۱۵۲۳ء) سے بھی ملے تھے جنھوں نے بابا فریدؒ کا کلام آپ کو دیا جسے آپ نے گرنتھ صاحب میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کسی تاریخ یا روایت سے معلوم نہیں ہوتا کہ آیا یہ کلام پہلے سے لکھا لکھایا بطور مسودہ آپ کو دے دیا گیا تھا یا آپ کو املا کرایا گیا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اگر یہ مسودہ تھا تو خطِ فارسی ہی میں ہوگا، اور اگر املا کرایا گیا تب بھی غالباً فارسی خط میں ہوگا کیونکہ بابا نانک ایک مدت سرکاری ملازمت میں رہ چکے تھے جہاں فارسی میں حساب کتاب رکھا جاتا تھا۔

فریدؒ ثانیؒ اور بابا نانک کی ملاقات کے متعلق ایک روایت یہ بھی ہے کہ کلام بابا فریدؒ کو بابا نانک اپنے طویل سیر و سفر کے دَوران میں پہلے ہی اکٹھا کر چکے تھے۔ اگر وہ فریدؒ ثانی سے ملنے کے لیے (جو اس وقت بابا فریدؒ کے جانشین کی حیثیت رکھتے تھے) اجودھن آئے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اُن سے بابا فرید کے کلام کو گرنتھ صاحب میں شامل کرنے کی باقاعدہ اجازت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ فریدؒ ثانی نے بابا نانک کی درخواست پر مراقبہ کیا جس سے اُن کی تسلی ہو گئی اور انھوں نے بابا نانک کو مطلوبہ اجازت دے دی۔ ایک بات جو اس روایت کے حق میں جاتی ہے، یہ ہے کہ کلامِ بابا فریدؒ کے موجودہ متن میں عربی فارسی کے اکثر لفظ ٹھیٹ پنجابی لہجے میں درج ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ الفاظ خاصے عرصے سے مقامی لوگوں کی زبان پر

چیتے رہے ہوں گے۔ اگر بابا نانک کو فریدؒ ثانی سے کلامِ فریدؒ کا کوئی لکھا لکھایا نسخہ ملا ہوتا تو گرنتھ صاحب میں اِن لفظوں کا لہجہ اتنا ٹھیٹ پنجابی نہ ہوتا۔

یہاں شاید یہ بتانا مناسب ہوگا کہ گرنتھ صاحب کی گورمکھی تحریر میں لفظ الگ الگ نہیں ہوتے بلکہ ہر شلوک میں پورے کا پورا مصرعہ اس طرح لکھا جاتا ہے گویا وہ ایک واحد لفظ ہو۔ لیکن ہماری اپنی طباعت میں ہر گورمکھی لفظ الگ ہے اور اس میں ہم نے گرنتھ صاحب کے ان اقتباسات کی طرزِ تحریر کا سہارا لیا ہے جو گورمکھی کی جدید کتابوں میں ملتی ہے۔ اسی طرح گرنتھ صاحب میں اگرچہ لفظ فریدؒ کو "پھرید" لکھا جاتا ہے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔

کلام بابا فریدؒ کے بابا نانک کے ہاتھ لگ جانے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گرنتھ میں درج ہو کر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔ اور یہ ہم پر بابا نانک کا ایک احسان بھی ہے۔ لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ بابا فریدؒ کے تخلیقی عہد سے یعنی تیرھویں صدی کے اواسط سے لے کر سولھویں صدی کے اوائل تک یعنی قریباً پونے تین سو سال ان کا پنجابی کلام کہاں اور کس حال میں رہا ؟ اغلب تو یہی کہ وہ بابا فریدؒ کے اخلاف کے پاس یونہی بندھا پڑا رہا ہوگا لیکن کیا ان کی گیارہ پشتوں میں سے کسی نے بھی اسے نہ پڑھا؟ اور اگر پڑھا تو کیا وہ ایسے کم ذوق تھے کہ وہ اس کے حسن، زور اور گہرائی سے متاثر نہ ہوئے ؟ کیا ایسے معاشرے میں جہاں بات بات پر شعر نقل کیے جاتے ہوں انھوں نے اس کے چیدہ چیدہ اشعار اپنے دوستوں کو نہ سنائے ہوں گے ؟ کیا وجہ ہے کہ ایسے بلند پایہ اور اثر آفرین شعر تیزی سے زبان زدِ خلائق نہ ہو گئے ؟ الغرض اِن اشعار یا شلوکوں کی ابتدائی اڑھائی تین سو سالہ تاریخ پر ایک بھاری پردہ پڑا ہوا ہے جسے آج تک کسی نے نہیں اٹھایا۔ صرف ایک فرنگی محقق میکالیف نے یہ کہہ کر اس کی توجیہ کی ہے کہ یہ اشعار بابا فریدؒ کے ہیں ہی نہیں، بلکہ یہ اُس دوسرے فریدؒ کے ہیں جسے بابا نانک اپنے سیر و سفر کے دَوران میں ملے تھے۔ لیکن یہ توجیہ ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں ؛ ہم بتاتے ہیں کیوں۔

میکالیف وہ پہلا شخص ہے جس نے کہا تھا (سکھ ریلیجن ۱۹۰۹ء) کہ گرنتھ صاحب میں درج "شلوک فریدؒ جی کے" تیرھویں صدی کے فریدؒ گنج شکر کے نہیں بلکہ سولھویں صدی میں ان کے جانشین فریدِ ثانی کے ہیں جنھیں بابا نانک اجودھن جا کر ملے تھے۔ ہمیں میکالیف اور اس کے نظریے سے کوئی بَیر نہیں، لیکن نظریہ بوجوہ بودا معلوم ہوتا ہے۔

پہلی بات جو میکالیف کے دعوے کے خلاف جاتی ہے، یہ ہے کہ حضرت بابا نانک جنھیں فریدِ ثانی (شیخ ابراہیم) نے بابا فرید کے شلوک اور شبد دیے تھے، کوئی معمولی شخص نہیں تھے بلکہ ایک شاعر اور شعر شناس انسان تھے جو ایک مدت سے مختلف صوفیوں اور بھگتوں کا کلام اکٹھا کر رہے تھے۔ قرینِ قیاس نہیں کہ انہوں نے کلامِ فریدؒ کے مُصنّف کے تشخص کے بارے میں بے پروائی برتی ہو۔ اگر وہ "شلوک فرید جی" کو تیرھویں صدی کے بابا فرید کی تصنیف سمجھتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم انھیں کسی اور کی تصنیف سمجھیں۔

بابا فرید کے کلام کا اُن کے وارثوں کے پاس کسی بیاض وغیرہ میں دو تین صدیوں تک محفوظ پڑا رہنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ لوگ اپنے بزرگوں کی نشانیاں اکثر جمع کر لیا کرتے ہیں اور وہ مدتوں یُوں ہی پڑی رہتی ہیں۔ پھر فریدِ ثانی کے متعلق کسی نے نہیں لکھا کہ وہ شاعر بھی تھے۔ اس لیے گرو نانک اور گرو ارجن کے فیصلے کو میکالیف کی قیاس آرائی کی وجہ سے معرضِ شک میں لانا کچھ معقول بات نہیں لگتی۔

اس کے علاوہ خود شلوکوں سے کچھ اندرونی شہادت ایسی ملتی ہے کہ وہ انہیں بابا فرید ہی کی تخلیق ثابت کرتی ہے۔ سب جانتے اور مانتے ہیں کہ بابا فرید ایک طویل عرصہ ایسی کڑی ریاضتیں کرتے رہے جو ان کا امتیازی نشان بن گئی ہیں۔ وہ ان ریاضتوں کے لیے یکسوئی کی جگہ ڈھونڈتے ہوئے کبھی ہانسی، کبھی ملتان اور کبھی اُچ جاتے رہے لیکن یہ انہیں کہیں میسر نہ آتی۔ ذیل کا شلوک ان کی سخت ریاضتوں اور اُن کی بے حاصلی کا بیان ہے۔ فریدِ ثانی ایسے تجربوں سے نہیں گزرے اس لیے یہ شعر اُن کا نہیں ہو سکتا :

تن تُکّا پنجر تھیا تلیاں کھُونڈن کاگ
اجے سو رب نہ بَوہڑیو، دیکھ بندے دے بھاگ! (۹۰)

بابا فریدؒ کے طویل فاقوں کی روایتیں بھی زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ مشہور ہے کہ آپ نے اپنے گلے میں ایک کاٹھ کی روٹی لٹکا رکھی تھی جسے بھُوک کے اضطراب میں آپ دانتوں سے کاٹ لیا کرتے تھے۔ آج بہت کم لوگ یہ مانیں گے کہ کوئی شخص محض لکڑی چاٹ کر زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن خود روایت کا بابا فریدؒ کے متعلق ہونا تو کسی نے کبھی نہیں جھٹلایا۔ اس لیے درج ذیل شلوک بابا فریدؒ کا تو ہو سکتا ہے، فریدِ ثانی کا نہیں :

روٹی میری کاٹھ دی لاوَن میری بھکھ

جنھاں کھادی چوپڑی گھنے سن گے دکھ (۲۸)

بابا فرید نے ایک بڑی لمبی عمر (تقریباً ۹۲ سال) پائی۔ فرید ثانی کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ اکسٹھ سال سے زیادہ عمر کو نہیں پہنچے۔ جو شلوک ذیل میں دیئے جاتے ہیں وہ ایک نوّد سالہ بوڑھے کی ہڈبیتی تو ہو سکتے ہیں، ساٹھ سالہ "بوڑھے" کی نہیں:

بُڈھا ہویا شیخ فریدا کنبن لگی دیہہ

جے سَو ورھیاں جیونا بھی تن ہوسی کھیہہ (۴۱)

اسی طرح یہ شلوک:

ایھنی نکی جھنگیئیں تھل ڈوگر بھویوم

اج فریدے کوجڑا سنّو کوہاں تھیووم (۲۰)

بہت بڑی عمر میں ہی آدمی اتنا بے بس ہوتا ہے کہ اسے پاس پڑا ہوا وضو کا کوزہ بھی سنّو کوس پر بھی معلوم ہونے لگے۔ فریدؒ ثانی اتنے بوڑھے کبھی نہیں ہوئے۔

پھر ہم بابا فریدؒ کی سوانح عمری سے یہ بھی جانتے ہیں کہ (ا) کھانے کو روکھی سوکھی روٹی اور (ب) چھپڑوں کی چھت والے کچے مکانوں کی رہائش جو بارش میں ٹپکنے لگتے تھے انھی کا حصہ تھی (ج) انھوں نے ہی موٹا جھوٹا کمبل کا لباس پہن کر عمر گزار دی اور (د) ہر قسم کی تنگی پر صبر اور شکر کیا۔ یہ ان کی ہڈبیتی تھی اور یہی ان کے اشعار میں بیان ہوئی ہے۔ یہ ہم کیسے مان لیں کہ بیتی کسی پر اور شعر ہیں کسی اور کے؟ ملاحظہ ہو ان اشعار میں ہڈبیتی کا بیان:

(ا) رُکھی سُکی کھائے کے ٹھنڈا پانی پی

دیکھ پرائی چوپڑی نہ ترساویں جی (۲۹)

(ب) کچر جھٹ لنگھایئے چھپّر ٹُٹے مینہہ (۱۸)

(ج) پاڑ پٹولا دھج کری کمبلڑی پہریو

جنھیں ویسیں شوہ ملے سوئی ویس کریو (۱۰۳)

(د) صبر منجھ کمان ہے صبر کا نیہنو

صبر سندا بان ہے خالق خطا نہ کری (۱۱۵)

بابا فرید کو کئی دفعہ جنگل کے پھلوں اور جنگلی مکھیوں کے شہد پر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ یہ ان کی زندگی کے تجربات میں سے تھا اور وہ ان کا بیان اپنے اشعار میں کرتے ہیں۔

رب کھجوریں پکیاں ماکھیو نئیں وہیَن

جو جو وںجے دیہڑا سو عمر ہتھ پوَن (۸۹)

افسوس ہے کہ ہمیں بابا فرید کے کسی ہمعصر پنجابی شاعر اور اس کے کلام کا علم نہیں ورنہ ہم اُن کے اشعار کے تقابلی مطالعے سے شلوکوں کے مُصنّف کا تعین کرنے کی کوشش کرتے۔ ان سے ذرا پہلے جو مسعود سعد سلمان نے کچھ پنجابی سی حرفیاں لکھیں وہ بھی اب ناپید ہیں۔ اس لیے تحقیق کا یہ دروازہ ہم پر بند ہے۔ لیکن ان کے بعد آنے والوں کے کلام پر نظر ڈالیں تو کچھ ایسے فرق سامنے آتے ہیں جو معنی خیز ہیں۔ فرید کے بعد پنجابی کے پہلے صُوفی شاعر شاہ حسین (۱۵۳۸ء - ۱۵۹۹ء) ہیں جن کے پیچھے سُلطان باہوؒ اور بُلھے شاہؒ کا دَور آتا ہے۔ ان کے یہاں ایک بڑا مضمون شرع اور طریقت کے اِختلاف اور تصادم کا ہے۔ شلوک فریدؒ میں اس مضمون کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ پھر ان سب کی شاعری مسلکِ وحدۃ الوجود کی پرچارک ہے۔ شلوک فریدؒ میں ایسا کوئی مسلک نظر نہیں آتا۔ پھر اُن کی کافیوں اور دُوہوں میں چرخے، پُونی، پچھی، جہیز اور گرُ پیر کی رہبری کے موضوعات بار بار استعمال ہوتے ہیں اور شاعر اپنے لیے مؤنث کا صیغہ برتتا ہے۔ فریدؒ ایسی چیزوں کے متعلق خاموش ہیں؛ زنانہ تکلم کی بجائے اپنی مجبوری داڑھی اور پگ کا ذکر کرتے ہیں اور گرُ پیر سے محض بے خبر ہیں۔ سولھویں صدی میں شبد اور شلوک راگوں کے پابند ہونے

گئے تھے لیکن بابا فریدؒ کے کلام کے متعلق یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ کسی راگ میں لکھے گئے تھے پس اگر شلوک فریدؒ سولھویں صدی کے فرید (ثانی) نے لکھے ہوتے جیسا کہ میکالیف کہتا ہے تو ان میں شرعِ طریقت، گرُ پیر، پُونی پچھی اور راگوں کے قصیے ضرور ہوتے۔ لیکن یہ چونکہ یہاں نہیں ملتے اس لیے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ان کا لکھنے والا ان قصیوں کے ظہور سے پہلے ہی دنیا سے جا چکا تھا۔ اور ایسا کون ہو سکتا ہے؟ قطعاً گنج شکر، کہ سولھویں صدی سے پہلے فرید تخلص کرنے والا صرف وہی ایک پنجابی شاعر ہے اور بس۔

میکالیف کی اَور دلیلیں فرید ثانی کے حق میں یہ ہیں کہ حضرت باباجی کا نام مسعود تھا، فرید نہیں تھا؛ دوسرے یہ کہ اُن کا خاندان ہندوستان میں ہنُوز نَووارد تھا اس لیے زبان پر وہ قدرت جو شلوکوں سے مترشح ہے، اُن کی نہیں ہو سکتی۔ یہ دونوں دلیلیں انتہا درجہ کمزور ہیں۔ پہلی دلیل اس لیے کہ اگر بابا کے معاصروں نے انہیں ایک دفعہ مسعود کہا ہے تو دس دفعہ فرید بھی کہا ہے۔ ان کے پیر بختیار کاکی اور اُن کے مرید نظام الدین اَولیا انھیں فریدؒ کہتے ہیں اور موخر الذکر نے تو اُن کے نام کا سجع بھی لکھا ہے:

پیر ما پیر است مَولانا فرید
ہمچو اُو در خلق مَولا نافرید

رہی زبان پر قدرت، تو وہ کئی نَووارد افراد میں یقیناً پائی جاتی ہے اور آپ میں سے کئی اصحاب نے اس کا خود مشاہدہ کیا ہوگا۔ لیکن اگر کسی کلاسیکی مثال کی ضرورت ہو تو امیر خسروؒ کو دیکھ لیجئے جن کی ہندوی زبان پر قدرت ضرب المثل ہے اور جنھیں ہندوستان میں آئے ایک سے زیادہ پشت نہیں گزری تھی۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر میکالیف اور اس کے مُتبعین کو کیا چیز اِس بات کے تسلیم کرنے سے روکتی ہے کہ گرنتھ صاحب کے شلوک فرید اول کے ہیں۔ میکالیف تو خیر پنجابی زبان کا ذوق نہیں رکھتا تھا لیکن دوسروں کی ضد ورائے فہم ہے۔ ایک طرف نانک اور ارجن کا فیصلہ اور شلوکوں کی زبان اور داخلی شہادت اور دوسری طرف محض قیاس آرائی اور ضد۔ نہیں، ہم میکالیف کے مفروضے کو نہیں مان سکتے۔

البتہ ایک بات قابلِ غور ہے۔ ایک ۱۳۰ سوتیس شلوکوں میں کئی شلوک برملا بابا نانک، گرو امرداس اور گرُو ارجن کے ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ ایسے شلوک بکھرے ہوئے ملتے ہیں جن میں بھگتی طرزِ فکر اور کبیر کے رنگِ احساس کا عکس سا پڑتا محسوس ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ شلوک سولھویں صدی کے ایسے شعراء کے ہوں جنھیں گرو نانک کے بعد گرنتھ صاحب کی تدوین کے ستر اسی سال کے دوران میں شامل گرنتھ کیا گیا ہو۔ لیکن کوئی بات یقینی طور پر کہنی مشکل ہے۔

بابا نانک کے ذوق و شوق نے فرید کے شلوک بچا تو لیے لیکن ان کی صورت آگے چل کر بعینہٖ وہ نہ رہی جس میں وہ انہیں ملے تھے۔ سِکھ گرنتھ کے جُز جُز جمع کرنے کے آغاز اور ۱۶۰۴ء میں اس کی تدوین کے خاتمے تک کے درمیان تقریباً پَون صدی کا عرصہ حائل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تیسرے گرُو یعنی گرُو امرداس (۱۴۷۹ء سے ۱۵۷۴ء) نے اسے اپنے کاتب پوتے سنسرام سے لکھوایا۔ معلوم نہیں کہ یہ کاتب کِس قابلیت کا مالک تھا۔ غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ بابا فرید اور دوسرے صوفیوں کے فارسی خط میں لکھے ہُوئے اشعار کو گورمکھی میں منتقل کیا گیا تھا۔ اس کے ایک مدت بعد پانچویں گرو ارجن (۱۵۶۳ء سے ۱۶۰۶ء) نے کئی اضافوں کے ساتھ گرنتھ صاحب کو اس شکل میں قلمبند کرایا جس میں اسے ہم آج دیکھ رہے ہیں۔ اس گفتگو سے ہمارا مقصود یہ بتانا ہے کہ شیخ ابراہیم (فرید ثانی) کے مہیا کردہ فارسی رسم الخط والے متن کو گورمکھی میں املا کرنے کے لیے کئی مختلف کاتبوں نے کام کیا تھا۔ نہیں معلوم وہ اس کام کے صحت کے ساتھ کرنے کی کتنی اہلیت رکھتے تھے۔ تاہم ایک بات جو گرُو صاحبان کی زندگی سے عیاں ہے، یہ ہے کہ وہ درویش لوگ تھے اور لوگوں کی ہدایت ہی انھیں مقصود تھی۔ وہ شاید مختلف زبانوں کے حرفوں کی اَصوات اور الفاظ کے تلفظ کے ماہر نہ تھے۔ اس لیے اگر ان کی گورمکھی میں بابا فرید کے عربی فارسی الفاظ کی اصوات پُوری طرح ظاہر نہیں ہوتیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔

بابا فرید کے گورمکھی میں املا شدہ کلام کے بعض نقائص ہمارے سامنے آتے ہیں جن کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ سہوِ کاتب سے پیدا ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر شلوک نمبر ۴ کو دیکھئے۔ اس میں پہلے مصرعے کے اندر "جاناں" کی املا نون غُنّہ سے ہوئی ہے اور دوسرے مصرعے میں بغیر نون غُنّہ کے:

فریدا جے جاناں تِل تھوڑڑے سنّمل بُک بھری
جے جانا سَہُ نندھڑا تاں تھوڑا مانُھ کری (۴)

اسی طرح شلوک نمبر ۸ کے پہلے مصرعے میں ایک ہی لفظ "تو" کو دو طرح اِملا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"فریدا جاں تَو کھٹن ویل تاں تُو رتا دُنی سیو" (۸)

اسی طرح شلوک نمبر ۱۲۴ میں لفظ نظر کو "ندر" لکھا ہے حالانکہ ندر کسی طرح بھی "نظر" کا تلفظ نہیں ہو سکتا۔

شلوکوں کا وزن لیکن ایک زیادہ بڑا اور واضح نقص جس کی وجہ ہمیں سمجھ نہیں آتی، یہ ہے کہ شلوکوں میں پچاس سے بھی اوپر ایسے مصرعے ہیں جن میں فریدا کا لفظ استعمال ہُوا ہے اور وہ قطعاً زائد از وزن ہیں۔ اگر اس کے استعمال کی وجہ شاعر کا نام ظاہر کرنا تھا تو فرید کے بہت سے شلوک بغیر فرید کے نام کے کیوں لکھے گئے؟ اور اگر وزن مقصود نہیں تھا تو اس کی کیا وجہ ہے کہ بہت سے شلوکوں میں فرید یا فریدا کا لفظ وزن میں درست اُترتا ہے؟ ہم مثالوں سے اپنی بات واضح کرتے ہیں:

شلوک ۲۸ کا پہلا مصرع جس طرح گرنتھ صاحب میں درج ہوا ہے اس کی صورت یہ ہے: فریدا روٹی میری کاٹھ کی لاون میری بھکھ

عروض اور تقطیع جاننے والوں کی بات تو دُور کی ہے معمولی کن رس بھی فوراً کہہ دے گا کہ یہاں فریدا کا لفظ زاید از وزن ہے اور مصرع اس کے بغیر ہی صحیح وزن میں رہ سکتا ہے۔ چنانچہ ہم نے کتاب کے نستعلیق حصے میں اسے بغیر "فریدا" ہی کے لکھا ہے، لیکن گورمکھی اور نسخ حصے میں گرنتھ صاحب کے تتبع کو لازم سمجھتے ہوئے "فریدا" کا لفظ رہنے دیا ہے۔ پھر اگر فریدا کا لفظ فرید کے ہر شلوک کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا تو اس شلوک (۳) میں جو یقیناً فرید ہی کا ہے فرید کا لفظ کیوں موجود نہیں؟

رکھُ نَ نبھے رکھُ نَ سجھے دُنیا گجھی بھاہِ

سائیں میرے چنگا کیتا ناھی تاں ہنبھی دجھاں آہِ (۳)

پھر خلافِ معمول ذیل کے شلوک (نمبر ۹) میں فریدا کا لفظ صحیح وزن میں کیوں ہے؟ "دیکھ فریدا ج تھیا داڑھی ہوئی بھُور"۔ الغرض شلوکوں میں لفظ فرید یا فریدا کے عدم اور وجود کی کوئی توجیہہ ہم نہیں کر سکے۔

ہمارا اندازہ ہے کہ ریاضتوں کے خارجی ڈسپلن سے قطع نظر، بابا فریدؒ کی فطرت ہی میں اپنی ذات کے لیے اذیت پسندی کا کوئی گہرا عُنصر موجود تھا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ گرو صاحبان بھی، جو جپ اور تپ میں ایک مقام رکھتے تھے، اپنے جوابی شلوکوں میں بابا فریدؒ کی جفا طلبی اور شکل کشی کو اُن کی اپنے آپ پر زیادتی سمجھتے ہیں اور اسے اعتدال کی طرف لانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مثلاً اگر بابا فرید نے کہا کہ تن کے تنور میں اپنے ہاڑ جلا ڈالو (۱۱۹) تو گرو نانک نے جواب میں کہا کہ ہڈیوں نے کیا قصور کیا ہے، رب کو اپنے دل میں ڈھونڈو (۱۲۰)؛ یا اگر فرید نے کہا کہ ریاضتوں میں رات رات بھر جاگتے رہو (۱۱۲) تو گرو نانک نے کہا کہ بعض سوتے ہوؤں کو رب خود اُٹھا کر حصہ دیتا ہے (۱۱۳)؛ یا اگر فریدؒ نے کہا ریشمی لباس پھاڑ پھینکو اور کمبل پہن لو (۱۰۳) تو گرو امر داس نے جواب دیا کہ بے شک ریشم پہنو لیکن طلب صادق رکھو (۱۰۴)۔

اب ایک دو باتیں کلام فرید کی نستعلیق میں منتقل کردہ تحریر کے بارے میں کُنی ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہماری طرزِ تحریر اُردو اور پنجابی کی عام طرزِ تحریر کے مطابق ہے۔ وارث شاہ، بُلّھے شاہ اور میاں محمد وغیرہ کا کلام جس طرز میں عموماً چھاپا جاتا ہے اُسی طرز و طریق میں ہم نے بابا فریدؒ کا کلام کتابت کرایا ہے۔ یہ وہی طرزِ تحریر ہے جسے انیسویں صدی کے اواخر میں سررشتۂ تعلیم پنجاب کے ڈائریکٹر ہال رائڈ نے پنجاب میں لکھی جانے والی اردو کتابوں کے لیے مقرر کیا تھا۔ اس میں تلفظ کی صحت کو مدِ نظر رکھنے کے باوجود تھوڑے تھوڑے اعراب لگانے کی تدبیر کی گئی تھی۔ چنانچہ ہماری پنجابی کتابوں میں بھی یہی طرزِ تحریر مروج ہے۔ تاہم جہاں کہیں تلفظ میں ابہام کا خدشہ تھا وہاں ہم نے پورے اعراب لگانے میں بُخل نہیں کیا۔ ہمارے بعض پنجابی اِدارے پچھلے چند سال سے پنجابی کے مخصوص ن کے لیے ݨ یا ڹ کی علامت استعمال کرنے اور لفظ کے درمیان میں آنے والے ن غُنّہ پر پرسیدھی جزم ڈالنے لگے ہیں۔ علیٰ ہذا وہ ملتانی لہجے کے ج اور گ کے لیے ڄ اور ڳ کی علامات استعمال کرنے لگے ہیں۔ لیکن ہم نے ان کا تتبع اس لیے نہیں کیا کہ ان تجویز کردہ علامتوں کو ابھی تک نہ قبولِ عام اور نہ منظوریٔ حکومت کی سند حاصل ہو سکی ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں ہم نے عام اُردو اور پنجابی طرزِ تحریر ہی کو اپنے اور اپنے قارئین کے لیے قابلِ ترجیح سمجھا ہے۔

ہم نے بابا فریدؒ کے کچھ ایسے پنجابی اشعار بھی درج کیے ہیں جو گرنتھ صاحب میں موجود نہیں۔ یہ اِکّا دُکّا مختلف کتابوں میں ملتے ہیں یا یونہی لوگوں میں زبانی زبانی چلے آتے ہیں۔ لیکن

یہ دیکھتے ہوئے کہ ان میں سے کئی شاہ حسینؒ اور بُلھے شاہؒ کے نام سے بھی منسوب ہیں اور بعض ایسے ہیں جن کا مضمون بہت عامیانہ ہے، ان کا اصلی ہونا بہت مشکوک معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے انھیں یہاں بطور ضمیمہ درج کیا جا رہا ہے۔

تشکر

ہمارے لیے بابا فریدؒ کے کلام کو اچھی طرح سمجھنے میں ایک رُکاوٹ یہ تھی کہ وہ قدیم پنجابی زبان میں ہے جس کے کئی لفظ آج کل متروک ہیں اور اب کم لوگ اُن کے معنی جانتے ہیں۔ دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ کلام فریدؒ کا قدیم ترین دستیاب متن گورمکھی رسم الخط میں ہے جس سے ہمارے لکھے پڑھے لوگوں کی اکثریت ناآشنا ہے۔ اس لیے ہم پر معین الحق فریدکوٹی کا شکریہ واجب ہو جاتا ہے کہ انہوں نے ان رکاوٹوں کو دُور کرنے میں ہماری دستگیری فرمائی۔ انہوں نے اپنے ذاتی کتب خانے کی ہندی، سندھی، پنجابی اور سنسکرت ڈکشنریوں سے کلامِ فرید کے غیر مانوس الفاظ کے معنی ڈھونڈنے میں بڑی محنت کی۔

پروفیسر محمد آصف خاں نے ایک درجن کے قریب کتابیں ہمیں مستعار دیں جن میں بابا فریدؒ کے شلوکوں شبدوں کو اُردو رسم الخط میں درج کیا گیا ہے۔ ان سے ہمیں گورمکھی متن کو اُردو نسخ اور نستعلیق صورت میں منتقل کرنے میں بڑی مدد ملی۔

سید سبط الحسن ضیغم نے ہمیں گرُو گرنتھ صاحب کے مکمل گورمکھی اور اُردو نُسخے دے کر ہماری بعض مُشکلات کو آسان کر دیا۔

ڈاکٹر سید اکرام حُسین عشرت، نجم حسین سید، سید امجد الطاف اور پروفیسر اسماعیل بھٹی کے مشوروں سے ہم نے استفادہ کیا ہے۔ ہم اُن کے سپاس گزار ہیں۔

گرو نانک دیو یونیورسٹی امرتسر کے پروفیسر کرنیل سنگھ تھند اور پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے پروفیسر گُرونت سنگھ نے بابا فریدؒ کے متعلق بہت سا گورمکھی، ہندی، انگریزی اور اُردو لٹریچر ہمیں عنایت فرمایا۔ ہم ان دونوں حضرات کے بے حد احسان مند ہیں۔

ہماری کتاب کا سرورق اور متن کے حاشیوں کی زیبا کاری محمود حسن رُومی صاحب کے فن اور کاوش کا اثر ہے جس نے کتاب کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ پیکیجز کے فوٹوگرافر وقار اور الیاس برنی نے اپنی ہنر مندی سے رُومی صاحب کے کام کی مدد کی۔ بشیر زمان کی کتابت نے کتاب کو دیدہ زیب بنانے میں بڑا کام کیا ہے۔ پاکستان میں کم کاتب ان جیسا خوش خط لکھ سکتے ہوں گے۔

ہمارے شکریے کا سب سے زیادہ حق دار پیکیجز کا ادارہ ہے جس نے کتاب کی طباعت پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا اور اس بات کا خاص خیال رکھا کہ اس کی قیمت اعتدال سے بڑھنے نہ پائے۔

(ڈاکٹر) سید نذیر احمد

لاہور، ۳۰ ستمبر ۱۹۸۴ء

کلامِ بابا فریدؒ شکر گنج

شلوک

جو گرنتھ صاحب سے ماخوذ ہیں

١

جِت ڈِہاڑے دھن وری ساہے لئے لکھاءِ
مَلک جے کنّی سُݨیندا مُونہہ ڈِکھالے آءِ
جِند نِمانی کڈھیسے ہڈاں کوں کڑکاءِ
ساہے لِکھے ، نہ چلنی ، جِندو کوں سمجھاءِ
جِند ووہٹی ، مرن وَر ، لے جاسی پرناءِ
آپن ہتھی جول کے کیں گل لگے دھاءِ
والوں نِکی پُرسلات کنّیں نہ سُݨی آءِ
فریدا کِڑی پوَندی اِی ، کھڑا نہ آپ مُہاءِ

۲

در درویشی گاگھڑی ، چلاں دُنیا بھت
بنھ اُٹھائی پوٹلی کِتھے ونجاں گھت

۳

کُجھ نہ بُجھے، کُجھ نہ سُجھے ، دُنیا گُجھی بھاہ
سائیں میرے چنگا کِیتا نئیں تاں ہنبھی دجھاں ہا

۴

جے جاناں تِل تھوڑڑے سنبھل بُک بھریں
جے جاناں شوہ ننڈھڑا تھوڑا مان کریں

۵

جے جاناں لڑچھّجنا پیڈھی پائیں گنڈھ
تیں جے وڈ ییں نہ کو ، سبھ جگ ڈِٹّھا ہنڈھ

۶

جے توں عقل لطیف کالے لِکھ نہ لیکھ
آپنے گریوان میں سر نیواں کر دیکھ

۷

جو تیں مارن مکّیاں تنھاں نہ ماریں گھمّ
آپنے گھر جائیے پیر تنھاں دے چمّ

٨

جاں تُو کھٹن ویل تاں تُوں رتا دُنی سیوں
مرگ سوائی نیہنہ ، جاں بھریا تاں لدیا

٩

دیکھ فریدا جو تھیا : داڑھی ہوئی بھُور
اگا نیڑے آیا پچھا رہیا دُور

١٠

دیکھ فریدا جو تھیا : سکر ہوئی وِس
سائیں باجھوں آپنے ویدن کہیئے کِس

۱۱

اکھّیں دیکھ پتیپنیاں ، سُن سُن رِینے کنّ
ساکھ پکنڈی آئی آ ، ہور کرینّڈی وَنّ

۱۲

کالیں جنھیں نہ راویا دَھولیں راوے کو
کر سایّیں سیئوں پرہڑی رنگ نویلا ہو

۱۳

کالیں دَھولیں صاحب سداہے جے کو چِت کرے
اپنا لایا پریم نہ لگّی جے لوچے سبھ کوءِ
ایہ پِرم پیالہ کھسم کا جَیں بھاوے تَیں دے

(از گرو امرداس)

۱۴

جن لوں جگ موہیا سے لوں یمں ڈِٹھ
کجّل ریکھ نہ سہندِیاں سے پنکھی سُوئے بہٹھ

۱۵

گُوکیندّیاں، چاکیندّیاں، متِیّں دینّدیاں نِت
جو شیطان ونّجایا سے کِت پھیرے چِت

۱۶

پِھِیو پواہی دبھ، جے سایئں لوڑیں سبھ
اِک پِچّھے، بیا لتاڑِیئے، تاں سایئں دے درواڑیے

۱۷

فریدا خاک نہ نندیے! خاکو جیڈ نہ کوءِ
جیوندیاں پیراں تلے، مویاں اُپرّ ہوءِ

۱۸

جاں لوبھ تاں نینہہ کیا؟ لُب تاں کُوڑا نینہہ
کِچر جھٹ لنگھائیے چھپرّ ٹُٹّے مینہہ

۱۹

جنّگل جنّگل کیا بھوَیں؟ وَن کنڈا موڑیں
وسّی رب ہیالیے، جنّگل کیا ڈھونڈیں

۲۰

ایہنیں نکی جنگھیئیں تھل ڈونگر بھوئیم
اَج فریدے کوجڑا سے کوہاں تھیوئیم

۲۱

فریدا راتیں وڈیاں ، دُھکھ دُھکھ اُٹھن پاس
دِھرگ تِنھاں دا جیویا ، جِنھاں وِڈانی آس

۲۲

جے مَیں ہوندا واریا مِتاں آیڑیاں
ہیَڑا جلے مجیٹھ جیئوں اُپر انگاراں

۲۳

لوڑے داکھ بجوڑیاں ، کِکّر بیجے جٹ
ہنڈھے اُنّ کتائے دا ، پَیدھا لوڑے پٹ

۲۴ - ۲۵

گلیئں چِکڑ ، دُور گھر ، نال پیارے نینّہہ
چلّاں تاں بِھجّے کمبّلی ، رہاں تاں ٹُٹّے نینّہہ

بِھجّو سِجّو کمبّلی ! اللہ ورسو مِینّہہ !
جاءِ مِلاں تِنھاں سجّناں ، ٹُٹّو ناہِیں نینّہہ

۲۶

مَیں بھُلاوا پِگ دا مَت مَیلی ہو جاۓ
گیہلا رُوح نہ جان ای سِر بھی مِٹّی کھاۓ

۲۷

شکّر، کھنڈ، نِوات، گُڑ، ماکھیوں، ماجھا دُدھ
سبھّے وستو مِٹّھیاں، رب نہ پُجّن تدُھ

۲۸

روٹی میری کاٹھ کی لاوَن میری بُھکھ
جِنھاں کھادی چوپڑی گھنے سہن گے دُکھ

۲۹

رُکھی سُکّی کھاءِ کے ٹھنڈا پانی پی
دیکھ پرائی چوپڑی نہ ترسائیں جی

۳۰

اَج نہ سُتّی کنّت سیوں آنگ مُڑیں مُڑ جاءِ
جاءِ پُچھّو ڈوہاگنی: تم کیو رَین وِہاءِ

۳۱

سَوہرے ڈھوئی نہ لہے، پیئیے ناہیں تھاوَں
پِر واتڑی نہ پُچھّئی، دھن سُہاگن ناوَں!

۳۲

سوہرے پیئیے کنت کی ، کنت اَگم اَتھاہ
نانک سو سوہاگنی جو بھاوے بے پرواہ

(از گرُو نانک)

۳۳

نھاتی ، دھوتی ، سنّبھی ، سُتّی آءِ نچنّد
رہی سُو بیڑی ہِنّگ دی ، گئی کتھوری گنّدھ

۳۴

جوبن جاندے نہ ڈراں جے شوہ پریت نہ جاءِ
کِتّی جوبن پریت بِن سُک گئے کملاءِ

۳۵

چِنت کھٹولا ، وان دُکھ ، بِرہ وِچھاون لیف
ایہہ ہمارا جِیونا ، توُں صاحِب سچّے ویکھ

۳۶

بِرہا بِرہا آکھیے ، برہا توُں سُلطان
جِت تن بِرہوں نہ اُپجے سو تن جان مسان

۳۷

فریدا ایہہ وِس گندلاں دھریاں کھنڈ لِواڑ
اِک راہینّدے رہ گئے ، اِک رادھی گئے اُجاڑ

۳۸

چار گوائیاں ہنڈھ کے ، چار گوائیاں سم
لیکھا رب منگیسیا : توں آیوں کیہڑے کم؟

۳۹

در دروازے جاءِ کے کیو ڈِٹھو گھڑیال
ایہہ ندوسا ماریے ، ہم دوساں دا کیا حال؟

۴۰

گھڑیے گھڑیے ماریئے پہریں لہے سزاءِ
سو ہیئڑا گھڑیال جیئوں ڈُکھی رَین وہاءِ

۴۱

بُڈّھا ہویا شیخ فریدو کنبّن لگّی دیہہ
جے سَؤ وَرھیاں جِیونا بھی تن ہوسی کھیہہ

۴۲

بار پرائے بَیسنا سائیں مجھے نہ دیہہ
جے توُں ایویں رکھسی ، جِیو سرِیروں لیہہ

۴۳ 26746

کنّدھ کہُاڑا ، سِر گھڑا ، وَن کے سر لوہار
ہَوں لوڑی شَوہ آپنا ، توُں لوڑیں انگیار

۴۴

اِکناں آٹا آگلا ، اِکناں ناہیں لون
اَگے گئے سِنجاپسن ، چوٹاں کھاسی کَون

۴۵

پاس دمامے ، چھتُ سِر ، بھیری ، سڈو رڈ
جاءِ سُتے جیران میں ، تھیے اَتیماں گڈ

۴۶

کوٹھے منڈپ ماڑیاں اُساریندے بھی گئے
کُوڑا سَودا کر گئے گوریں آءِ پئے

۴۷

کھنتھڑ میکھاں اگلیاں ، جند نہ کائی میکھ
واری آپو آپنی چلے مشایخ شیخ

۴۸

دو دیویں بلنڈیاں ، ٹنک بہیٹھا آء
گڑھ لیتا ، گھٹ لُٹیا ، دیوڑے گیا بجھاء

۴۹

ویکھ کیا ہے جو تھیا ، جو سِر تھیا تِلاں
کمادے اَر کاگدے ، کُنّے ، کوئلیاں
منڈے عمل کریندیا ! ایہہ سزا تنہاں

۵۰

کنھ مُصلّا ، صُوف گل ، دِل کاتی ، گڑ وات
باہر دِسّے چانَنا دِل اندھیاری رات

۵۱

رتّی رَت نہ نِکلے جے تن چِیرے کوءِ
جو تن رتّے رب سیوں تِن تَن رت نہ ہوءِ

۵۲

ایہہ تن سبھو رت ہے ، رت بن تن نہ ہوءِ
جو شوہ رتے آپنے تِت تن لوبھ رت نہ ہوءِ
بھے پیئے تن کھیں ہوءِ ، لوبھ رت وِچوں جاءِ
جیوں بیسنتر دھات سُدھ ہوءِ
تیوں ہر کا بھو دُر مت میل گواءِ
نانک تے جن سوہنے جو رتے ہر رنگ لاءِ

(واز گوڑ مہلا ۳)

۵۳

سو اِی سرور ڈھونڈ لیہہ جتھوں لبھی وتھ
چھپڑ ڈھونڈے کیا ہوئے ؟ چکڑ ڈبے ہتھ!

۵۴

ننڈھی کنت نہ راویو ، وڈّی تھی موئیاس
دھن گُوکینڈی گوریں تیَں شوہ نہ رِلیاس

۵۵

سِر پلیا ، داڑھی پلی ، مُچھّاں بھی پلیاں
رے من گیہلے باورے مانیں کیا رلیاں؟

۵۶

کوٹھے ڈُھکن کیتڑا ؟ پِر رِندڑی نِوار
جو دیہنہ لدھے گانویں گئے وِلاڑ وِلاڑ

۵۷

کوٹھے منڈپ ماڑیاں ایت نہ لائیں چِت
مٹی پئی اَتولویں کوئی نہ ہوسی مِت

۵۸

فریدا منڈپ مال نہ لاءِ مرگ ستانی چِت دھر
سائی جاء سمھال جتھے ہی تو ونجنا

۵۹

جِنھیں کمّیں ناہیں گُن تے کمڑے وِسار
مت شرمندہ تھیوہیں سائیں دے دربار

۶۰

صاحِب دی کر چاکری دِل دی لاہ بھرانْد
درویشاں نوُں لوڑیہے رُکھّاں دی جیرانْد

۶۱

کالے مَیڈْے کپڑے ، کالا مَیڈْا ویس
گنُہیں بھریا مَیں پھِراں لوک کہیں درویش

۶۲

تتّی توءِ نہ پَلوُے جے جل ٹُبھّی دے
جو ڈْوہاگن ربّ دی جھوریندْی جھوُرے

٦٣

جاں کواری تاں چاؤ وِواہی تاں ماملے
فریدا ایہو پچھتاوٗ وت کنواری نہ تھیے

٦٤

کلّر کیری چھپڑی آءِ اُلتھے ہنجھ
چنجو بوڑن نہ پیویں اُڈن سندی ڈنجھ

٦٥

ہنس اُڈر کودھرے پیا لوک وِڈارن جاءِ
گیہلا لوک نہ جاندا ہنس نہ کودھرا کھاءِ

۶۶

چل چل گئیاں پنکھیاں جنھیں وسائے تل
سَر بھریا بھی چلسی تھکے کنّول اِکل

۶۷

اِٹ سرہانے ،بھوئیں سوَن ، کیڑا لڑیو ماس
کیتڑیاں ُجگ واپرے اِکتُ پییاں پاس

۶۸

بھنّی گھڑی سوَنوِّی ، ٹُٹّی ناگر لجّ
ِعزرائیل فریشتہ کیں گھر ناٹھی اَجّ

۶۹

بھنّی گھڑی سوَنوّی ، ٹُٹّی ناگر لج
جو سجن بھوئیں بھار تھے سے کیوں آوِیں اَج

۷۰

بے نمازا کُتیا ! ایہہ نہ بھلّی ریت
کبھی چل نہ آیا پنجے وقت مسیت

۷۱

اُٹھّ فریدا وضو ساز ، صُبح نماز گزار
جو سر سائیں نہ نِوے سو سر کپ اُتار

۷۲

جو سِر سائیں نہ نِویں سو سِر کپیجے کاۓ
کُنّے ہیٹھ جلائیے بالن سنّدے تھاں

۷۳

کِتھے تیڈے ماپے آ جِنھی توُں جنیوں
تیَں پاسوں اوہ لد گئے توُں اَجے نہ پتینوں

۷۴

فریدا من میدان کر ٹوئے ٹِبّے لاہ
اَگے موُل نہ آوَسی دوزخ سندی بھاہ

۷۵

فریدا خالق خلق میں ، خلق وسّے رب ماہنہ
مندا کِس نوں آکھیے جاں تِس بِن کوئی ناہنہ

(از گرو ارجن)

۷۶

جِس دیہنہ نالا کپّیا جے گل کپّیں چُکھ
پوَن نہ اِتّی ماملے ، سہاں نہ اِتّی دُکھ

۷۷

چبّن ، چلن ، رتن ، سَے سُنیَر بھی گئے
ہیَڑے مُتّی دھاہ سَے جانی چل گئے

۷۸

فریدا بُرے دا بھلا کر غُصّہ من نہ ہنڈھاء
دیہی روگ نہ لگ ای پَلّے سبھ کجھ پاء

۷۹

فرید پنکھ پَروہنی دُنی سُہاوا باغ
نوَبت وَجّی صُبح سیؤں چلّن کا کر ساج

۸۰

رات کتھُوری وَنڈییَے ، سُتّیاں مِلے نہ بھاوَ
جِنھاں نیَں نِندراوے تِنھاں ملن کواوَ

٨١

مَیں جانیا دُکھ مُجھی کو دُکھ سبھائے جگ
اُچّے چڑھ کے دیکھیا تاں گھر گھر ایہا اَگ

٨٢

فریدا بھُوم رنگاولی مَنجّھ وِسولا باگ
جو جَن پِیر نواجیا تِنھاں آنچّ نہ لاگ

(از گرو ارجن)

٨٣

فریدا عمر سہاوڑی سنّگ سوَنڑی دیہہ
وِرلے کوئی پائیئَن جِنھاں پیارے نیہہ

(از گرو ارجن)

۸۴

کندھی ، وہن ! نہ ڈھاہ ، توُں بھی لیکھا دیوݨا
جدھر رب رضاءِ وہن تداوَں گوَ کرے

۸۵

دُکھّاں سیتی دینہہُ گیا ، سُولاں سیتی رات
کھڑا پُکارے پاتنی : بیڑا کپّر وات!

۸۶

لمّی لمّی ندی وہے ، کندھی کیرے ہیت
بیڑے نوُں کپّر کیا کرے جے پاتن رہے سچیت

۸۷

گلّیں سو سجّن وِنہۂ ، اِک ڈھونڈیندی نہ لہاں
دُھکھاں جیوں مالیہہ ، کارن تِنھاں ما پِری

۸۸

فریدا ایہہ تن بھَوکنا نِت نِت دُکھیے کَون
کنیّں بُجّے دے رہاں کِتّی وَگّے پوَن

۸۹

ربّ کھجُورِیں پکّیاں ماکھیا نیّیں وہن
جو جو وَنجّے ڈیہڑا سو عُمر ہتھ پوَن

۹۰

تن سُکّا پنجر تِھیا تلیاں کھُونڈن کاگ
اَجے سو رب نہ بَوہڑیو دیکھ بندے کے بھاگ!

۹۱

کاگا کرنگ ڈھنڈولیا سگلا کھایا ماس
ایہہ دو نَیناں مت چھوہیو پِر دیکھن کی آس

۹۲

کاگا چونڈ نہ پنجرا، بس اے تاں اُڈ جا
جِت پنجرے میرا شَوہ وسے ماس نہ تِدوں کھا

۹۳

گور نمانی سڈ کرے : نگھریا گھر آؤ
سر پر یئں تھے آونا ، مرنوں نہ ڈریاؤ

۹۴

ایہنیں لوئنیں ویکھدیاں کیتی چل گئی
لوکاں آپو آپنی یئں آپنی پئی

۹۵

آپ سنواریں یئں ملیں ، یئں ملیاں سکھ ہوء
جے توں میرا ہو رہیں سبھ جگ تیرا ہوء

۹۶

کندھی اُتّے رُکھّڑا پِھرک بھنّے دِھیر
پَچھّے بھانڈے رکھیے پِھر تائیں نِیر

۹۷

محل نستھّن رہ گئے واسا آیا تّل
گوراں سے بِمانیاں بھسن رُوحاں مَل
آکھیں شِیخا "بندگی"! چلّن اَج کہ کل

۹۸

مَوتے دا بنّا ایویں دِستے جیوُں دریاوے ڈھاہَ
اَگے دوزخ تپیا سُنیے ہُول پوَے کہاہَ
اِکناں نوُں سبھ سُوجھی آئی، اِک پھردے بےپرواہَ
عمل جو کیتے آ دُنی وِچ سے درگاہ اوگاہَ

۹۹

دریاوے کنّے بگلا بیٹھا کیل کرے
کیل کریندے ہنجھ نوُں اچنتے باز پئے
باز پئے تِس رب دے، کیلاں وِسریاں
جو من چِت نہ چیتے سن سو گالہیں رب کیاں

۱۰۰

ساڈھے ترے من دیہڑی ، چلّے پانی انّ
آیو بندہ دُنی وِچ وت آسونی بنھّ
مَلکُ المَوت جاں آوَسی سبھ درّوبے بھنّ
تِنھاں پیاریاں بھائیاں اَگے دِتّا بنھّ
ویکھو بندہ چلّیا چَونّہہ جنیاں دے کنھّ
عمل جو کیتے دُنی وِچ درگہ آئے کمّ

۱۰۱

ہَوں بلہاری تِنھاں پنکھیاں جنگل جِنھاں واس
کنکر چُگّن ، تھل وسن ، رب نہ چھوڈن پاس

۱۰۲

رُت پِھری وَن کنبیا ، پت جھڑیں جھڑ پائیں
چارے کُنڈاں ڈُھونڈِیاں رہن کِتھاؤں ناہیں

۱۰۳

پاڑ پٹولا دَھج کریں ، کمبلڑی پہریو
جِنھیں ویسیں شَوہ مِلے سَے اِی ویس کریو

۱۰۴

کاتے پٹولا پاڑتی کمبلڑی پہرے
نانک گھر ہی بَیٹھیاں شَوہ ملے
جے نیّت راس کرے

(گرو امرداس)

۱۰۵

گرب جنھاں وڈیائیاں ، دھن جوبن آگاہ
خالی چلے دھنی سیوں ٹبے جیوں مینہاہ
(از گرو ارجن)

۱۰۶

تنھاں مکھ ڈراونے جنھاں وساریو ناؤں
ایتھے دکھ گھنیرے آ اگے ٹھور نہ ٹھاؤں

۱۰۷

پچھل رات نہ جاگیوں جیوندڑو مویوں
جے تیں رب وساریا تیں رب نہ وسریوں

۱۰۸

فریدا کنت رنگاولا ، وڈّا بے محتاج
اللہ سیتی رتّیا ایہہ سچاوا ساج

(از گرو ارجن)

۱۰۹

فریدا دُکھ سُکھ اِکُ کر ، دِل ہتھیں لاہ وِکار
اللہ بھاوے سو بھلا تاں لبھّی دربار

(از گرو ارجن)

۱۱۰

دُنی وجائی وجدی ، توُں بھی وجّیں نال
سوئی جیو نہ وَجّدا جس اللہ کردا سار

(از گرو ارجن)

۱۱۱

دِل رتّا اِس دُنی سیوں ، دُنی نہ کِتے کم
مِثل فقیراں گاکھڑی سو پایِئیے پُور کرم

(از گرو ارجن)

۱۱۲

پہلے پہرے پُھلڑا ، پھَل بھی پِچھّا رات
جو جاگن لہن سے سائیں کنوں دات

۱۱۳

دائیں صاحب سنّدیاں ، کیا چلے تِس نال!
اِک جاگندے نہ لہن اِک سُتیاں دے اُٹھال

(از گرو نانک)

۱۱۴

ڈھونڈیندیئے سُہاگ کُوں ! توَ تن کائیَ کور
جِنھاں ناوَں سُہاگنی تِنھاں جھاک نہ ہور

۱۱۵

صبر منجھّ کمان اے ، صبر کا نیہنو
صبر سنڈّا بان ، خالِق خطا نہ کری!

۱۱۶

صبر اندر صابری ، تن ایوَیں جالین
ہون نجیک خداءِ دے ، بھیت نہ کِسے دین

۱۱۷

صبر ایہہ سُآؤ ، جے توُں بندہ دِڑ کریں
ودھ تھیویں دریاؤ ، ٹُٹ نہ تھیویں واہڑا

۱۱۸

فرِید درویشی گاکھڑی ، چوپڑی پرِیت
اِکن کِنھے چالی اے درویشاوی رِیت

۱۱۹

تن تپے تنّور جیُوں بالن ہڈ بلن
پیرِیں تھکّاں سِریں جُلاں جے مُوں پِری مِلن

۱۲۰

تن نہ تپاءِ تنوُر جیوں بالن ہڈ نہ بال
سِر پَیریں کیا پھیڑیا اندر پِری نِہال

(از گرُو نانک)

۱۲۱

ہَوں ڈُھونڈیندی سجنّاں ، سجّن مَیڈے نال
نانک اَلکھ نہ لکھیے ، گرُ مُکھ دیتے دِکھال

(از گرُو رام داس)

۱۲۲

ہنسّاں دیکھ ترندیاں بگّاں آیا چاوَ
ڈُب موئے بگ بپُڑے ، سِر تل اُپر پاوَ

(از گرو رام داس)

۱۲۳

یَں جانا وڈ ہنس ہے تاں یَں کِیتا سنگ
جے جانا بگ بَپُڑا جنم نہ بھیڑی انگ

(از گرو امرداس)

۱۲۴

کیا ہنس کیا بگلا، جا کو نظر دھرے
جے تِس بھاوے نانکا کاگوں ہنس کرے

(از گرو نانک)

۱۲۵

سرؤر پنکھی ہیکڑو پھاہیوال پچاس
ایہہ تن لہریں گڈ تِھیا، سچے تیری آس!

۱۲۶

کوَن سو اکھّر، کوَن گُن ، کوَن سو منیا منّت
کون سو ویسو ہوَں کری جت وَس آوے کنّت

۱۲۷

نِوَن سو اکھّر ، کھوَن گُن ، جِیہبا منیا منّت
ایہہ ترَے بھَینے ویس کر تاں وَس آوی کنّت

۱۲۸

مت ہونّدی ہوئے ایانا تان ہوندے ہوئے نِتانا
اَن ہونّدے آپ ونڈائے: کوئی ایسا بھگت سدائے

۱۲۹

اِک پھکّا نہ گالائیں ، سبھناں میں سچّا دھنی
ہیاؤ نہ کہیں ٹھاہیں ، مانک سبھ امولویں

۱۳۰

سبھناں من مانک ، ٹھاہن مُول مچانگوا
جے تو پریا دِی سِک ہیاؤ نہ ٹھاہیں کہیں دا

شبد

آسا بانی پہلی

دِلوں مُحبّت جِنّیں سَے ای سچّے آ
جِنّیں من ہور، مُکھ ہور، سَے کانڈھے کچّے آ
رتّے عِشق خداءِ رنگ دِیدار کے
وِسّریا جِنّیں نام تے بھوئیں بھار تھئے

آپ لیے لڑ لاءِ در درویش سے
تِن دھَن جنیندی ماؤ آئے سپھَل سے

پرودِگار، اپار، اگم، بے انّت توُں
جنھاں پچھاتا سچّ چُماں پیر مُوں

تیری پنہ خدائے توں بخشندگی
شیخ فریدے خیر دِیجے ، بندگی !

آسا بانی دوسری

بولے شیخ فرید پیارے اللہ لگے
ایہہ تن ہوسی خاک نمانی ، گور گھرے
اَج مِلاوا شیخ فرِید
ٹھاکم کونجڑِیاں ، منوں مچندڑِیاں

جے جانا مَر جائیے گھُم نہ آئیے
جھُوٹھی دنیا لگ نہ آپ ونجائیے

بولیے سچ دھرم ، جھوٹھ نہ بولیے
جو گرُ دَسّے واٹ مُریداں جولیے

چھَیل لگھنڈّے پار ، گوری من دِھیریا
کنچن وَنّے پاسے کلوَت چِھیریا

شیخ حیاتی جگ نہ کوئی تِھر رہیا
جِس آسن ہم بیٹھے کیتے بَیس گیا

کتک کُونجاں ، چیت ڈَونّہہ ، ساوَن بِجلیاں
سیالے سوہنّدیاں پِر گل باہڑیاں

پچھلے پچھلنہار وِچاراں سے ءِ منوں
گنڈھیندیاں پچھے ماہ ترُٹندیاں ہِک کھِنو

زمی ، پچھے اسمان ، فریدا ، کھیوٹ رکن گئے
جالن گوراں نال اُلاہمے جِیا سہے

راگ سُوہی

تپ تپ لُوہ لُوہ ہاتھ مروڑو
باوَل ہوئی سو شَوہ لوڑو

تَیں شوہ من مَنّہ کیا روس
مجھ اَوگن شوہ ناہیں دوس
تَیں صاحب کی یَیں سار نہ جانی
جوبن کھوءِ پاچھے پَچھوتانی

کالی کوئِل تُو کِت گُن کالی
اپنے پریتم کے ہَوں بِرہے جالی
پِرہے بِہُوں کِتھہِ سُکھ پائے
جاں ہوءِ کرپال تاں پربھُو مِلائے

وِدھن کھُوہی مُنّدھ اکیلی
نہ کو ساتھی نہ کو بیلی

کر کِرپا پربھ سادھ سنّگ میلی
جاں پھر دیکھاں تاں میرا اللہ بیلی

واٹ ہمارِی کھری اُڈِینی
کھنّیوں تِکھی بہُت پِیَینی
اُس اُوپر ہَے مارگ میرا
شیخ فریدا پنتھ سمھار سویرا

سُوہی لَلِت

بیڑا بندھ نہ سکیوں بندھن کی ویلا
بھر سرؤر جب اُچھلے تب ترن دُہیلا

ہتھ نہ لاءِ کُسنبھڑے جل جاسی ڈھولا

اِک آپی نے پت لی شوہ کیرے بولا
دُدھا تھنی نہ آویئ پھر ہوئے نہ میلا

کہے فرید سہیلیو شوہ اَلائسی
ہنس چلسی ڈُمنا، ایہہ تن ڈھیری ہوسی

اشارات

ਜਿਤੁ ਦਿਹਾੜੈ ਧਨ ਵਰੀ ਸਾਹੇ ਲਏ ਲਿਖਾਇ ॥
ਮਲਕੁ ਜਿ ਕੰਨੀ ਸੁਣੀਦਾ ਮੁਹੁ ਦਿਖਾਲੇ ਆਇ ॥
ਜਿੰਦ ਨਿਮਾਣੀ ਕਢੀਐ ਹਡਾ ਕੂ ਕੜਕਾਇ ॥
ਸਾਹੇ ਲਿਖੇ ਨ ਚਲਨੀ ਜਿੰਦੂ ਕੂੰ ਸਮਝਾਇ ॥
ਜਿੰਦੁ ਵਹੁਟੀ, ਮਰਣੁ ਵਰੁ, ਲੈ ਜਾਸੀ ਪਰਣਾਇ ॥
ਆਪਣ ਹਥੀ ਜੋਲਿ ਕੈ, ਕੈ ਗਲਿ ਲਗੈ ਧਾਇ ॥
ਵਾਲਹੁ ਨਿਕੀ ਪੁਰਸਲਾਤ ਕੰਨੀ ਨ ਸੁਣੀ ਆਇ ॥
ਫਰੀਦਾ ਕਿੜੀ ਪਵੰਦੀਈ, ਖੜਾ ਨ ਆਪੁ ਮੁਹਾਇ ॥੧॥

١
جِتُ دِھاڑے دھن وری ساہے لئے لِکھاءِ
مَلکُ جِ کنی سُنِیدا مُہہ دیکھالے آءِ
جِندَ نِمانی کڈِھیَے ھڈا کُو کڑکاءِ
سّاہے لِکھے، نہ چلنیٰ جِنّدُ کُوں سمجھاءِ
جِندُ وہٹی، مرنُ ورُ لےَ جاسی پرناءِ
آپنٔ ہتھی جولِ کےَ کےَ گلِ لگےَ دھاءِ
والہُ نِکی پُرسلات کنی نَ سُنی آءِ
پھریدا کِڑی پوَنّدی اِی، کھڑا نَ آپُ مُہاءِ

غیر مانوس الفاظ اور اُن کے معنی : جِت = جس / دہاڑے = دن / دھن = عورت / وری = سگائی گئی / ساہا = جوتش کے مطابق بیاہ کا مقررہ دن / جِنّد = جان / نِمانی = مان کے بغیر؛ بے چاری / کُوں = کو / کڑکلے = توڑے؛ کڑکا = ہڈی ٹوٹنے کی آواز / مرن = مرنا۔ مرن مصدر ہے لیکن یہاں اسم کے معنی دیتا ہے؛ موت یا ملک الموت / ور = بر، خاوند، دُولہا / پرناءِ = بیاہ کر / جول کے = جلن مصدر سے، رخصت کرکے / کیں = کس کے / دھاءِ = دھاون مصدر سے مشتق، دوڑکر، بھج کے۔ کسی کے گلے لگنے سے پہلے فرطِ شوق سے دو ایک قدم تیزی سے اُٹھائے جاتے ہیں؛ یہ دھانا ہوتا ہے / پُرسلات = پُل صراط، پنجاب کے عوام اب بھی اسے پُرسلات تلفظ کرتے ہیں۔ یہ ایک بال سے باریک پُل ہے جس پر سے قیامت کے دن خلقت گزرے گی۔ نیک لوگ اِس پر سے بآسانی گزر کر جنت میں داخل ہوں گے لیکن گنہ گار کٹ کر نیچے دوزخ میں جا گریں گے۔ / کِڑی = آواز، خبردار کرنے یا بُلانے کی بلند آواز / مُہا = گنوا، پریشان ہو؛ نہ آپ مہاءِ = آپ پریشان نہ ہو، اپنا آپ نہ گنوا۔

شلوک کی اُردو نثر : جس دن عورت (مُراد انسانی رُوح) کی سگائی ہوئی اس کے بیاہ (مُراد رخصتی یا موت) کا دن لکھ لیا گیا۔ (پھر جب یہ دن آ پہنچا) ملکُ الموت (جس کا ذکر) کانوں سے سنتے آئے ہیں، آ مُنہ دکھاتا ہے۔ وہ بے چاری جان کو (جسم سے) نکالتا ہے اور ہڈیوں کو کڑکاتا ہے۔ جان کو (جو نکلنے پر راضی نہیں) سمجھاتا ہے کہ "رخصتی کا وقت لکھا گیا ہے، (اب تمہارا کوئی عُذر) نہیں چلے گا"۔ جان دُولہن ہے اور ملکُ الموت دُولہا، وہ اسے یقیناً بیاہ کرکے جائے گا۔ (جسم جو جان کے لیے بمنزلہ باپ کے تھا) جان کو اپنے ہاتھوں رُخصت کرکے اب کس کے گلے لگے گا (یعنی تسلی حاصل کرنے کے لیے)۔ آگے بال سے باریک پُل صراط ہے۔ کیا تیرے کان کو نہیں سنائی دیتی، اے فرید،

وہ آواز جو (بلاوے کی) پڑ رہی ہے۔ اب کھڑا رہ کر اپنا آپ نہ گنوا (یا کھڑا پریشان نہ ہو)۔

بابا فریدؒ کے بیشتر شلوک دو دو مصرعوں کے ہیں، لیکن یہ شلوک آٹھ مصرعوں کا ہے اور اس لیے استثنائی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات معنی خیز ہے کہ شلوکوں کی ابتدا موت اور انسانی رُوح کی بیچارگی کے ذکر سے ہوئی ہے۔ قاری کا ذہن اشعار کے ایسے مجموعوں کی طرف جائے گا جو حمدِ خداوندی کی بجائے شکایت سے شروع ہوتے ہیں، مثلاً رُومی کی مثنوی جو "بشنو از نے چوں حکایت می کُند" یا غالب کا دیوانِ غزلیات جو "نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا" سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن یہ سچائی فراموش نہ ہو کہ شکایت محبوب ہی سے کی جاتی ہے، محبت نہ ہو تو کوئی عالی ظرف انسان حرفِ شکایت منہ سے نہیں نکالتا۔ بہر حال یہ شلوک اس ٹریجڈی کو ہمارے سامنے لاتا ہے جو انسان کا مقدّر اور تقدیر ہے اور جسے ٹالا نہیں جا سکتا کیونکہ وہ انسان کے اجزائے ترکیبی کی آویزش ہی سے پیدا ہوتی ہے چنانچہ "جندو کو سمجھا" کر اسے اپنی تقدیر پر راضی کر لینا ہی انسان کا سب سے بڑا اختیار بتایا گیا ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਦਰ ਦਰਵੇਸੀ ਗਾਖੜੀ ਚਲਾ ਦੁਨੀਆ ਭਤਿ ॥
ਬੰਨਿ੍ ਉਠਾਈ ਪੋਟਲੀ ਕਿਥੈ ਵੰਵਾ ਘਤਿ ॥੨॥ ॥ ۲

فریدا در درویسی گاکھڑی چلا دُنیا بھتِ
بنھ اُٹھائی پوٹلی کِتھے ونجھا گھتِ

در = دروازہ، منزل۔ بقول ایک پنجابی سکالر کے قدیم پنجابی میں "در" راستہ بھی ہوتا تھا / گاکھڑی = مشکل / بھت = کی طرح، طرز، طریق / پوٹلی = گٹھڑی / ونجھا = ونجھاں، جاوں / گھت = ڈال کر / "بنھ اٹھائی پوٹلی" = مرکب توصیفی بھی ہو سکتا ہے جس میں "پوٹلی" موصوف کی صفت "بنھ اُٹھائی" ہوگی، لیکن یہ پُورا جملہ بھی ہے، یعنی پوٹلی باندھ اٹھائی ہے / فریدا کا لفظ وزن سے باہر ہے۔ مصرع اس کے بغیر ہی موزوں رہ سکتا ہے۔

اُردو نثر: اے فرید! درویشی کے دروازے (راستے؟ منزل؟) کا حصول مشکل ہے۔ (کیوں نہ میں) چلوں دنیا (والوں کے) طریق پر۔ لیکن یہ جو باندھ کر اٹھائی ہوئی ہے گٹھڑی، کہاں جاؤں اسے ڈال (پھینک) کر؟

اس شلوک کی تشریح دو طرح سے ہو سکتی ہے نہیں کہا جا سکتا بابا فرید کے ذہن میں اس کا مفہوم کیا تھا۔ ایک نظر سے دیکھا جائے تو "پوٹلی" دنیاوی ساکھ کا ساز و سامان اور اس کی طمع ہو سکتا ہے جسے دنیا میں رہتے ہوئے اپنے سے الگ کر دینا مشکل ہے کیونکہ اس سے دوسروں کی نگاہ میں آدمی کا وقار باقی نہیں رہتا۔ لیکن "پوٹلی" درویشی کے طریق پر قائم رہنے کے ارادے کی علامت بھی ہو سکتا ہے۔ مُرید جادۂ سلوک پر ابھی نیا نیا چلا ہے اور منزلِ درویشی کی مشکلات سے گھبرا اُٹھا ہے۔ اُس نے پاسِ وضعداری سے ترکِ سلوک تو نہیں کیا لیکن اس کا دل بہانے ڈھونڈتا ہے کہ اپنی نگاہ میں سُبک ہوئے بغیر کس طرح اس بوجھ سے (جسے قرآن شریف کے مطابق پہاڑوں نے اٹھانے سے انکار کر دیا تھا اور جسے اس نے نادانی سے اٹھا لیا تھا) اپنے آپ کو آزاد کرائے۔ درویشی کی منزل کو یہاں انسانیت کی منزل اور گراں بار ذمہ داری سمجھا سکتا ہے۔

ਕਿਝੁ ਨ ਬੁਝੈ ਕਿਝੁ ਨ ਸੁਝੈ ਦੁਨੀਆ ਗੁਝੀ ਭਾਹਿ ॥ ۳
ਸਾਂਈ ਮੇਰੇ ਚੰਗਾ ਕੀਤਾ ਨਾਹੀ ਤ ਹੰਭੀ ਦਝਾਂ ਆਹਿ ॥੩॥

کِجھُ نَ بُجھے کِجھُ نَ سُجھے دُنیا گُجھی بھاہِ
سائیں میرے چنگا کیتا ناہی تَ ہنّبھی دجھاں آہِ

کِھ = کُجھ / نَ = نہ / سُجھئے = بُوجھا جائے، سمجھ آئے / سُجھئے = سُجھائی دے، نظر آئے / گُجھی = پوشیدہ / بھاہ = آگ / سائیں = سائیں = مالک، خدا / ناہی تِ = نہیں تو / ہَنْھی = ہَوں بھی، میں بھی۔ "ہَوں ہندی اسم ضمیر بمعنی مَیں / دجھاں آہ = جل جاتا / نوٹ کریں کہ گرنتھ صاحب کی تحریر میں شد استعمال نہیں ہوئی حالانکہ مرّجہ پنجابی میں سُجھے سُجھے اور گُجھی مشدّد لفظ ہیں۔ اسی طرح سائیں کی طرزِ تحریر پر بھی نظر ڈالیے جس میں مروّجہ نون غنّہ موجود نہیں۔

سادہ نثر: کچھ سمجھ نہیں آتا، کچھ نظر نہیں آتا، یہ دنیا (ایک) پوشیدہ آگ ہے۔ میرے خدا نے اچھا کیا (یعنی مجھے بچالیا) نہیں تو میں بھی (اس آگ میں) جل جاتا۔

اس شلوک کا مضمون ایک حد تک پچھلے شلوک سے پیوستہ معلوم ہوتا ہے، یعنی سالک درویشی کی مشکلات کا متحمل نہ ہو سکنے پر اسے چھوڑ دینے لگا تھا لیکن خدا نے اسے سہارا دیا اور وہ سیدھی راہ پر جما رہا۔ البتہ پچھلے شلوک میں مشکلات کو راہ اور سفر کے سمبل یا علامتوں میں بیان کیا گیا تھا اور یہاں انہیں آگ کے استعارے میں۔ اس جگہ یہ کہا جا رہا ہے کہ اوپری نظر خواہ حقیقت کو نہ دیکھ پائے اور اسے دنیا خوبصورت معلوم ہو لیکن اصل میں دنیا ایک آگ ہے جس سے دُور رہنا ہی اچھا ہے، اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب خدا کی توفیق شاملِ حال ہو ورنہ انسان اس آگ میں جل کر بھسم ہو جاتے۔

ਫਰੀਦਾ ਜੇ ਜਾਣਾਂ ਤਿਲ ਥੋੜੜੇ, ਸੰਮਲਿ ਬੁਕੁ ਭਰੀ ॥
ਜੇ ਜਾਣਾ ਸਹੁ ਨੰਢੜਾ, ਥੋੜਾ ਮਾਣੁ ਕਰੀ ॥੪॥

۴

فریدا جے جاناں تِل تھوڑڑے سنّمل بُکّ بھری
جے جانا سَہُ ننّڈھڑا تاں تھوڑا مانُ کری

جے جاناں = اگر جانتا / تِل = یہ ایک جانا پہچانا بیج ہے جسے کھایا بھی جاتا ہے اور جس سے تیل بھی نکالا جاتا ہے۔ بعض شارحین نے لکھا ہے کہ شادی کی ایک رسم ایسی ہوتی تھی کہ اس میں دُلہا اور دُلہن ایک دوسرے کو مٹھی بھر کر تل دیتے تھے۔ لیکن اکثر شارح تل سے مراد سانسوں کی تعداد یا زندگی کے دن لیتے ہیں۔ تاہم ان میں کوئی معقول مماثلت ہمیں نظر نہیں آئی / تھوڑڑے = تھوڑے کی تصغیر، یعنی بہت تھوڑے۔ پنجابی اسموں کے آخر میں ڑے لگا کر اُن کی تصغیر بنانا ایک عام قاعدہ ہے / سنّمل = سنبھل کر، پوری سوچ کے بعد / بُکّ = خالص پنجابی لفظ ہے جس کے معنی ہیں اوک۔ بُک اُدھ کھلا ہاتھ ہے جس میں کوئی دانے دار شے اُٹھالی جائے۔ / سَہُ = شَوہ یعنی کھسم یا مالک / ننّڈھرا = چھوٹا یا نوجوان لڑکا۔ بھگت بانی میں یہ لفظ "ننّڈھنا" کر کے درج ہوا ہے۔ / مان = غرور / شلوک کے دونوں مصرعوں کے شروع میں "جے جاناں" (= اگر جانتا) کے الفاظِ شرط آئے ہیں جن کی جزا "بُک بھری" اور "مان کری" لکھی گئی ہے۔ لیکن آج کل کی مروجہ پنجابی زبان کے مطابق "بُک بھری" اور مان کری" کسی طرح بھی "بُک بھرتا اور "مان کرتا" کے مساوی نہیں ہوتے۔ غالباً قدیم پنجابی گرامر کے مطابق جزا کے اظہار کا یہی اسلوب ہوتا ہوگا۔

نثر: اے فرید اگر میں جانتا کہ تل بہت تھوڑے ہیں تو سنبھل کر (اُن سے) بُک بھرتا۔ یعنی اگر جانتا کہ زندگی کا وقت تھوڑا ہے تو لمحاتِ زیست سوچ سنبھل کر گزارتا۔ اور اگر میں جانتا کہ میرا مالک چھوٹی عمر کا ہے (گویا بچپنے کا سا مزاج رکھتا ہے یعنی بے پرواہ ہے) تو میں (اپنی خوبیوں پر) اتنا زیادہ اعتماد نہ کرتا۔ مراد یہ کہ نجات عملوں پر زیادہ منحصر نہیں۔ خدا بے پرواہ ہے گنہ گاروں کو بھی بخش دیتا ہے اور عابدوں زاہدوں کو بھی پکڑ سکتا ہے۔ اس شلوک میں دونوں مصرعوں کے الگ الگ معنی صاف نہیں اور دونوں کا باہمی تعلق تو بالکل ورائے فہم ہے۔

ਜੇ ਜਾਣਾ ਲੜੁ ਛਿਜਣਾ, ਪੀਡੀ ਪਾਈਂ ਗੰਢਿ ॥
ਤੈ ਜੇਵਡੁ ਮੈ ਨਾਹਿ ਕੋ, ਸਭੁ ਜਗੁ ਡਿਠਾ ਹੰਢਿ ॥੫॥

۵

جے جاناں لڑُ چھجنا پیڈی پائیں گنڈھِ
تَے جے وڈُ مَے ناہ کو سبھُ جگُ ڈِٹھا ہنڈھِ

لڑ = کسی چادر یا پگڑی وغیرہ کا کونا / لڑ چھجنا = اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک پُورا جملہ : لڑ ٹوٹ جائے گا یا لڑ چھوٹ جائے گا۔ دوسرے مرکب توصیفی : ٹوٹ جانے والا لڑ، بودا لڑ / وڈ = بڑا، عظیم / پیڈی = پیڈھی : پکّی / نے ناہ کو = میرے لیے کوئی نہیں / ڈٹھا = دیکھا / ہنڈھ = برت کے۔ بظاہر "پائیں" قدیم پنجابی میں "پاتا" یعنی ڈالنا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے پچھلے شلوک میں "بھریں" بمعنی بھرتا اور "کریں" بمعنی کرتا بھی اسی طرح کا استعمال ہے۔ ہمیں معلوم نہیں لیکن شاید کسی نحوی نے اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہو ؟

نثر : اگر یہ جانتا کہ لڑ ٹوٹ جائے گا تو اس میں گرہ پکی ڈالتا۔ تیرے جیسا بڑا میرے لیے کوئی نہیں۔ (میں نے) سارا جگ دیکھا ہے برت کر۔

پہلے مصرعے میں کچھ مجازی رنگ جھلکتا ہے کیونکہ اُس میں اس تعلق کی بات کی گئی ہے جس کے ٹوٹ جانے کا امکان تھا اور وہ ٹوٹ گیا بھی ہے۔ ایک حسرت کے ساتھ کہا جا رہا ہے کاش میں اسے بیرونی اسباب سے پختہ کر لیتا۔ اس کے برعکس جو رشتہ خدا کے ساتھ بندھتا ہے اس کی نوعیت ہی ایسی ہے وہ ٹوٹنے والی شے نہیں۔ پہلے مصرعے کا دوسرے سے تعلق کچھ زیادہ واضح نہیں۔ محض محبوب کی عظمت کا ذکر ہے اور یہ محبوب بہ نسبت مجاز کے حقیقت سے قریب تر ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਜੇ ਤੂ ਅਕਲਿ ਲਤੀਫੁ, ਕਾਲੇ ਲਿਖੁ ਨ ਲੇਖ ॥
ਆਪਨੜੇ ਗਿਰੀਵਾਨ ਮਹਿ, ਸਿਰਿ ਨੀਵਾਂ ਕਰਿ ਦੇਖੁ ॥੬॥

۶

فریدا جے توُ عقلِ لطیفُ کالے لِکھ نَ لیکھ
آپنڑے گِریوان مہِ سِرُ نِیواں کرِ دیکھُ

عقلِ لطیف = لطیف عقل : ایسی عقل جو باریک بین ہو یا لطیف حقیقتوں سے آگاہ ہو اور ان میں تمیز کر سکتی ہو۔ لیکھ = لکھائی : پنجابی میں اس سے عموماً نوشتۂ تقدیر مُراد لیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں غالباً تقدیر نہیں بلکہ عمل مراد ہے / کالے لکھ نہ لیکھ = بظاہر مراد ہے کہ سیہ کاری نہ کر / آپنڑے = اپنے / گریوان = گریبان / مہ = میں۔

اُردو نثر : اے فرید اگر تو باریک بین عقل رکھتا ہے تو سیاہ "لیکھ" نہ لکھ (بلکہ) اپنے گریبان میں سر نیچا کر کے دیکھ۔ پہلے مصرعے میں واضح طور پر سکتہ پڑتا ہے جو لفظ "فریدا" کو "لطیف" کے بعد لانے سے ٹھیک ہو سکتا ہے۔ اس طرح : جے توں عقلِ لطیف فریدا کالے لکھ نہ لیکھ، لیکن معنوں کے متعلق پھر بھی تسلی نہیں ہوتی۔ اول اس لیے کہ جملے کا فعل غائب ہے، دوسرے اس لیے کہ عقلِ لطیف کا کام باریکیوں میں تمیز کرنا ہے نہ کہ سیاہ کاریوں سے روکنا۔ تاہم لفظوں سے پہلے مصرعے کے سیدھے معنی نکلتے ہیں کہ اگر تو باریک بین عقل کا مالک ہے تو سیاہ کاری نہ کر۔ لیکن یہ مضمون اگلے مصرعے کے مضمون سے وہ تقابل (کنٹراسٹ) نہیں پیدا کرتا جو غالباً شاعر کا مقصود تھا۔ سر نیچا کر کے اپنے گریبان میں دیکھنا اور اپنے اعمال کا محاسبہ کرنا بہت اچھی بات ہے لیکن اس کا تعلق نہ "کالے لیکھ" لکھنے سے ہے نہ "عقلِ لطیف" سے۔ شاید اسی لیے بعض شارحین نے "کالے لیکھ نہ لکھ" کا مطلب "کھینچ تان کر" "دوسروں کی سیاہ کاری کا نہ دیکھنا یعنی اُن کے عیبوں کا تجسس نہ کرنا" بنا دیا ہے جس سے دونوں مصرعوں میں وہ تقابل پیدا ہو جاتا ہے جو بظاہر یہ شارحین پیدا کرنا چاہتے تھے۔ غالباً تین صدیوں کی اُس طویل مدت میں جو شعر کی آمد اور گرنتھ صاحب میں اُس کے لکھے جانے کے درمیان آئی اس کے الفاظ میں کچھ کمی بیشی ہوئی ہے جس سے لفظ و معنی کا وہ چُست ربط جو ہونا چاہیے تھا، نہیں رہا۔

ਫਰੀਦਾ ਜੋ ਤੈ ਮਾਰਨਿ ਮੁਕੀਆਂ, ਤਿਨ੍ਹਾ ਨ ਮਾਰੇ ਘੁੰਮਿ ॥
ਆਪਨੜੈ ਘਰਿ ਜਾਈਐ, ਪੈਰ ਤਿਨਾ ਦੇ ਚੁੰਮਿ ॥੭॥

فریدا جُ تےَ مارنِ مُکیا تِنہا نَ مارے گھُمِ ۷
آپنڑےَ گھر جائیےَ پیَر تِنہا دے چُمِ

گھُم = گھوم کر، مُڑکر، یعنی بدلے میں / آپنڑے = اپنے / تنھا دے = اُن کے

اُردو نثر : اے فرید، جو تجھے مُکّیاں ماریں (تُو) اُنہیں مُڑکر نہ مار (بلکہ) اُن کے پاؤں چُوم اور اپنے گھر چلا جا۔

اس شلوک کے پڑھتے ہی قارئین کا ذہن حضرت عیسٰے علیہ السلام کے اس ارشاد کی طرف جائے گا جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ "اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو تُو دوسرا بھی اس کے آگے کر دے"۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام بے مثل بلاغت رکھتا ہے اور ہزاروں سال سے لوگوں کے عمل کو متاثر کر رہا ہے تاہم بابا فرید بھی اپنی طرز میں بُرائی کے بدلے میں بُرائی نہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ افراد کے درمیان یہ طریق ہی احسن ہے، ورنہ بدلا لینے اور پھر اُس بدلے کا بدلہ لینے کا سلسلہ تو کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتا۔ کسی نہ کسی مقام پر ہمت والے کو بدلہ چھوڑ دینے کی توفیق ہوگی تو یہ سلسلہ ختم ہوگا ورنہ چلتا ہی رہے گا، اور خاندانوں کے خاندان برباد ہوتے رہیں گے۔ اب شاید کسی کے ذہن میں یہ اعتراض اُبھرے کہ قرآن شریف میں تو آیا ہے کہ "تمہارے لیے بدلہ لینے میں زندگی ہے" تو واضح ہو کہ یہ بدلہ عدالت کے فیصلے کے تحت آتا ہے، نہ یہ کہ جو اُٹھے اپنے خیال کے مطابق جس طرح چاہے اپنے مخالف سے بدلہ لینے لگے۔ اس پر مزید یہ ہے کہ اپنا بدلہ چھوڑ دینے اور مخالف سے درگزر کرنے کو دوسری جگہوں پر بدلہ لینے سے بہتر کہا گیا ہے۔ یعنی چاہو تو اپنا دوسرا گال مخالف کے آگے کر دو۔ مگر یہ نہیں کہ کسی بے گناہ کو طمانچے پڑ رہے ہوں اور تم اس کا چُپ چاپ تماشہ دیکھتے رہو۔ مظلوم کی مدد کا حکم دیا گیا ہے قرآن میں۔

ਫਰੀਦਾ ਜਾਂ ਤਉ ਖਟਣ ਵੇਲ, ਤਾ ਤੂ ਰਤਾ ਦੁਨੀ ਸਿਉ ॥
ਮਰਗ ਸਵਾਈ ਨੀਹਿ, ਜਾਂ ਭਰਿਆ ਤਾਂ ਲਦਿਆ ॥੮॥

فریدا جاں تؤ کھٹن ویل تاں تُو رتا دُنی سیو ۸
مرگ سوائی نِیہہ جاں بھریا تاں لدِیا

جاں = جب / تؤ = تیرا / کھٹن ویل = کمائی کا وقت / تاں = تب / رتّا = رنگا، رنگا رہا، معروف رہا / سیو = سے، کے ساتھ / مرگ = موت / سوائی = بڑھتی گئی، پُختہ ہوتی گئی / نیہہ = محبت ؛ یا بُنیاد ؟ / بھریا = بھر گیا، مراد غالباً پیمانہٴ عمر کے بھر جانے سے ہے / لدیا = لد گیا۔ ایک شارح کے مطابق یہ لفظ لُدیا ہے یعنی اُنڈیل دیا گیا۔

اُردو نثر : اے فرید جب تیرا کمائی کا وقت تھا تب تو رنگا (معروف) رہا دنیا میں۔ موت کی قُربت بڑھتی گئی، جب بھر گئی (انتہا کو پہنچی) تو کوچ ہو گیا۔

پنجابی اور ہندی شاعری میں بہت سے معاملے اور مضمون بنجارے اور اس کے کاروبار کی اصطلاحوں اور استعاروں میں بیان کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس شلوک کے پہلے مصرعے میں "کھٹن ویل" کی اصطلاح سے مراد ہے نیکی کمانے یا یادِ خدا کا وقت اور "رتا دُنی سیو" سے مُراد عیش دُنیا یا کاروبارِ دنیا میں محو ہونا۔ یعنی جس وقت نیکی کمانے کا موقع تھا وہ لہو و لعب میں گزار دیا۔ دوسرے مصرعے کے معنی صاف نہیں لیکن اٹکل سے یہ سمجھا جائے گا کہ جب موت بالکل قریب آ گئی اور دنیا سے کوچ ہونے لگا تو نیکی کمانے

کا وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

معلوم نہیں "مرگ سوائی نیہ" کے معنی کیا ہو سکتے ہیں۔ موت کی بنیاد پختہ ہو گئی تھی یا موت نے محبت نبھالی یا نزدیک آ گئی یا کیا؟ اکثر شارحین "بھریا" سے سانس کا پورا ہو جانا مراد لیتے ہیں، لیکن یہ واضح نہیں کہ اس لفظ سے یہ معنی کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایک شارح کے نزدیک "بھریا" پیمانہ عمر کے متعلق کہا گیا ہے اور مصرعے کا آخری لفظ "لدیا" نہیں بلکہ لَدیا ہے یعنی "اولد" دیا گیا یا اُٹھا دیا گیا۔ اس مصرعے کو کسی طرح بھی دیکھا جائے معنی مبہم ہی رہتے ہیں اور پہلا مصرعہ جس کے معنی صاف ہیں اس کی تفہیم میں کوئی مدد نہیں دیتا۔

اس کے علاوہ پہلے مصرعے کا وزن درست نہیں۔ ہاں اگر "جاں تو کھٹن ویل فریدا..." پڑھیں تو وزن درست ہو سکتا ہے۔ دوسرے مصرعے کا وزن اگر کچھ ہے تو وہ اس وزن سے بالکل مختلف ہے جو شلوکوں کی غالب اکثریت کا ہے۔ الغرض اس شلوک سے متعلق بہت سے سوال ہیں جن کا ہم جواب نہیں دے سکتے۔

ਦੇਖੁ ਫਰੀਦਾ ਜੁ ਥੀਆ ਦਾੜੀ ਹੋਈ ਭੂਰ ॥
ਅਗਹੁ ਨੇੜਾ ਆਇਆ ਪਿਛਾ ਰਹਿਆ ਦੂਰਿ ॥੯॥

٩

دیکھ فریدا جُ تھیا داڑی ہوئی بھُور
اگہُ نیڑا آئیا پِچھا رہیا دُورِ

جو تھیا = جو ہوا ہے / بھُور = سفید / اگہُ = اگلا مقام۔ مُراد موت یا بڑھاپا۔ بعض شارحین نے "اگہُ" کے معنی "اگلی طرف سے" لکھے ہیں۔ ہمارے خیال میں "اگہُ" لفظ "پچھا" کا متقابل ہے، اور چونکہ "پچھا" (= پچھلا یا گزرا ہوا وقت) اسم ہے اس لیے "اگہُ" بھی اسم ہوگا۔ تابع فعل یعنی Adverb نہیں ہوگا / نیڑا = نزدیک۔ مروجہ پنجابی میں یہ لفظ "نیڑے" ہونا چاہیے / پِچھا = پچھلا یا گزرا وقت یعنی جوانی یا روزِ پیدائش۔

نثر: اے فرید! دیکھ جو ہوا ہے، تیری داڑھی سفید ہو گئی ہے۔ اب اگلا وقت (موت کا) نزدیک آ گیا ہے اور پچھا (جوانی یا روزِ پیدائش) دُور رہ گیا ہے۔

بابا فرید کی شاعری میں جو مضمون سب سے زیادہ دُہرایا گیا ہے وہ موت اور بڑھاپے کی تکلیفوں کا مضمون ہے۔ جو شے زندگی کو ایک المیہ بنا دیتی ہے، یہ ہے کہ زندگی جسے قدرتی طور پر پُرمسرت ہونا چاہیے مختلف نوع کی ناکامیوں سے تلخ ہو جاتی ہے (سکر ہوئی وِس شلوک ١٠) اور وہ باوجود سعیِ بلیغ کے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتی اور سو برس کی ریاضتیں بھی اسے خدا کی معرفت کے قریب نہ لے جاتیں (اجے سو رب نہ بوہڑیو دیکھ بندے دے بھاگ۔ شلوک ٩٠)۔ پھر سب پر مزید یہ کہ باوجود طویل عرصے پر پھیلی ہوئی ناکامیوں اور تلخیوں کے، زندگی کی خواہش پھر بھی باقی رہتی ہے اور موت کے قریب آتے جانے اور زندگی کے "کھیہ" ہو جانے کا خوف بہر حال اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے (بڈھا ہویا شیخ فریدا کنبن لگی دیہہ جے سَو ورھیاں جیونا بھی تن ہوسی کھیہ شلوک ٤١)

ਦੇਖੁ ਫਰੀਦਾ ਜਿ ਥੀਆ ਸਕਰ ਹੋਈ ਵਿਸੁ ॥
ਸਾਂਈ ਬਾਝਹੁ ਆਪਣੇ ਵੇਦਣ ਕਹੀਐ ਕਿਸੁ ॥੧੦॥

١٠

دیکھ فریدا جِ تھیا سکر ہوئی وِسُ
سائیں باجھہُ آپنے ویدن کہیئے کِسُ

جِ = جے لیکن معنا یہاں "جو" ہوگا / سکر ہوئی وِس = شکر زہر بن گئی۔ زندگی کی لذتیں تلخ ہو گئیں / سائیں = سائیں۔ مالک۔ خدا۔ محبوب / باجھ = بغیر۔ سوا /

ویدن = دُکھ - درد -

نثر: اسے فرید زرا دیکھ جو ہوا ہے: شکر کی مٹھاس زہر (کی تلخی) ہوگئی ہے۔ اب اپنے مالک کے سوا اپنے دُکھ درد کس سے کہیں۔
یہ مقام جہاں وہ چیزیں جو زندگی کو پُرمسرت بناتی ہیں زہر کی طرح تلخ ہو جایئں درد کے سفر میں بہت آگے کا مقام ہے۔ یہ المیہ گہرے احساس والوں پر ہی وارد ہوتا ہے۔ اس ایلیے کی شکایت بھی دوسروں سے نہیں کی جا سکتی۔ شاید وہ اسے سمجھ ہی نہ پایئں۔ یہ صرف اپنے خدا ہی سے کی جا سکتی ہے

ਫਰੀਦਾ ਅਖੀ ਦੇਖਿ ਪਤੀਣੀਆਂ ਸੁਣਿ ਸੁਣਿ ਰੀਣੇ ਕੰਨ ॥
ਸਾਖ ਪਕੰਦੀ ਆਈਆ ਹੋਰ ਕਰੇਂਦੀ ਵੰਨ ॥੧੧॥

11

فریدا اکھی دیکھ پتینیاں سُن سُن رِینٹے کن
ساکھ پکنّدی آئی آ ہور کرینّدی ون

اکھی = اکھیں، آنکھیں / پتینیاں = کمزور ہوگیئں / رینٹے = خالی ہوگئے، مراد بہرے ہوگئے / ساکھ = فصل، مُراد جسم / پکنّدی آئی آ = پکنے پر آ ئی ہے، پک گئی ہے / وَن = رنگ۔

نثر: اسے فرید آنکھیں دیکھ دیکھ کر کمزور ہوگیئں اور کان سُن سُن کر بہرے ہوگئے۔ جسم کی فصل پکنے پر آگئی ہے اور اب وہ اور ہی رنگ بدل رہی ہے۔
اس شلوک کا مضمون ایک حد تک پچھلے شلوک کے مضمون سے پیوستہ ہے۔ دونوں شلوک زندگی کے تجربے کے گہرے ہو جانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس تجربے کے گہرے ہونے کی وجہ عمر کی طوالت سمجھ لیجئے (جو بابا فرید کی فی الواقعہ تھی) یا وارداتِ حیات کا تلخ ہونا۔ بہر حال نتیجہ یہ ہے کہ دل دنیا کی لذتوں سے بھر گیا ہے اور انہیں اپنے آپ سے پرے رکھنے کی طرف مائل ہے۔ دنیا کی لذتیں کچھ نئی نہیں؛ شکلوں کا وہی رنگ و روغن اور سرود و نغمہ کی وہی چھنا چھن جنھیں دیکھ دیکھ کر اور سُن سُن کر آنکھیں اور کان پک گئے ہیں۔ یہ چیزیں جو شروع میں حواس کو بھلی لگتی تھیں اب زہر کی طرح کڑوی لگتی ہیں۔
اس مضمون کے ساتھ یہاں اور بعض دوسرے شلوکوں میں ایک دبی آواز یہ بھی سنائی دے جاتی ہے کہ عمر کے ساتھ نہ صرف رنگ و نغمہ کا ذوق بلکہ عبادات و مجاہدات کا شوق بھی ماند پڑتا جاتا ہے۔
شعر کی اصوات اور روانی الفاظ اس کے معنوں کو دل نشین کرانے کا موثر ذریعہ بن گئے ہیں۔ خصوصاً آخری ٹکڑہ "ہور کرینّدی ون" بڑا بلیغ ہے اور ایک ڈرامائی انداز رکھتا ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਕਾਲੀਂ ਜਿਨੀ ਨ ਰਾਵਿਆ ਧਉਲੀ ਰਾਵੈ ਕੋਇ ॥
ਕਰ ਸਾਂਈ ਸਿਉ ਪਿਰਹੜੀ ਰੰਗੁ ਨਵੇਲਾ ਹੋਇ ॥੧੨॥

12

فریدا کالیں جِنھی نہ راویا دھولی راوَے کوءِ
کرسائیں سیو پرہڑی رنگُ نویلا ہوءِ

کالیں وہ زمانہ جب بال کالے تھے، جوانی کے وقت / راویا = مانیا، راضی کیا، رجھایا / دھولیں = دھولے (سفید) بالوں کے وقت، بڑھاپے میں / سائیں = سایئں، خدا / سیو = سے / پرہڑی = پریم، پیار / نویلا = نویکلا، نیا۔

اسے فرید جنہوں نے کالے بالوں (جوانی) کے زمانے میں محبوب (رب) کو راضی نہ کیا، (اُن میں سے) کوئی ہی سفید بالوں کے زمانے (بڑھاپے) میں اسے راضی کرے گا۔

سائیں (رب) سے پیار کر، رنگ نیا ہوگا۔

پہلے مصرعے کے معنی کما حقہٗ سمجھنے میں یہ دِقت ہے کہ "جنھوں" کے جواب میں گرامر "انھوں" یا "وہ" کا تقاضا کرتی ہے لیکن یہاں ایسا کوئی جواب نہیں دیا گیا، بلکہ جواب کو تشنہ چھوڑ کر ایک نیا جملہ "وَھویں راوے کو" لے آیا گیا ہے۔ تاہم اٹکل سے ان دونوں ٹکڑوں کو ملا کر یہ معنی پیدا کیے جاسکتے ہیں کہ جنھوں نے جوانی میں یادِ خدا نہ کی ان میں سے شاید ہی کوئی بڑھاپے میں یادِ خدا کرے گا۔ دوسرا مصرع پہلے سے پُوری طرح پیوستہ نہیں بلکہ ایک علیحدہ مضمون بیان کرتا ہے۔ مرید سے کہا جا رہا ہے کہ سائیں (رب) سے محبت کرو، نیا رنگ ہوگا، نیا رنگ ہوگا کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ تم یہاں ایک نئی دنیا پاؤ گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم خود ایک نئے رنگ میں رنگے جاؤ گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تمہارے چہرے پر نور آجائے گا؛ اور بھی بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ رب سے محبت کرنے کی جو تلقین کی گئی ہے اور جس کی جزا "نویلا رنگ" سنائی گئی ہے اس کا سمجھنا ہمارے لیے آسان نہیں۔ خدا ایک لطیف حقیقت ہے جو احساس سے ورا بلکہ ورا الورا ہے اس سے محبت کے معنی ہمارے نزدیک کچھ ایسا ہوگا کہ اس کی مخلوق سے محض لِوجہ اللّٰہ یعنی خالصۃً خدا کے لیے محبت رکھی جائے۔ بہت سے لوگ اللّٰہ سے محبت کے معنی ذکر اللّٰہ اور اس کی پیدا کردہ کائنات میں غور و خوض کرنا سمجھتے ہیں۔ الغرض مختلف طبائع اس کے مختلف معنی متعین کریں گی، جیسا کہ رُومیؒ نے ایک چرواہے اور حضرت موسیٰؑ کی مشہور حکایت میں لکھا ہے کہ چرواہا اپنے خیال میں مست خدا سے کہہ رہا تھا کہ اے خدا تو میرے سامنے آتا کہ میں تیرے پاؤں دابوں تیرے بالوں میں کنگھی کروں وغیرہ وغیرہ تو موسیٰؑ نے اسے ڈانٹا کہ کیا کفر بک رہے ہو تو جناب موسیٰؑ پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوئی کہ میرا بندہ مجھ سے جس رنگ میں کرسکتا ہے پیار کرنے، تم اسے مجھ سے الگ نہ کرو:

وحی آمد سُوئے موسیٰ از خدا — بندۂ مارا چرا کردی جدا

تو برائے وصل کردن آمدی — نے برائے فصل کردی آمدی

ਫਰੀਦਾ ਕਾਲੀ ਧਉਲੀ ਸਾਹਿਬੁ ਸਦਾ ਹੈ ਜੇ ਕੋ ਚਿਤਿ ਕਰੇ ॥
ਆਪਣਾ ਲਾਇਆ ਪਿਰਮੁ ਨ ਲਗਈ ਜੇ ਲੋਚੈ ਸਭੁ ਕੋਇ ॥
ਏਹੁ ਪਿਰਮੁ ਪਿਆਲਾ ਖਸਮ ਕਾ ਜੈ ਭਾਵੈ ਤੈ ਦੇਇ ॥੧੩॥

۱۳
فریدا کالی دَھولی صاحب سدا ہے، جے کو چِت کرے
اپنا لایا پِرمُ نَ لگ اِی جے لوچے سبھُ کوءِ
ایہُ پِرمُ پیالا کھسم کا جَے بھاوَے تَے دےءِ (گُرو امرداس)

"کالیں" اور "دَھولیں" کے معنی وہی ہیں جو پچھلے شلوک میں ہم لکھ آئے ہیں۔/ صاحب سدا ہے = خدا ہمیشہ (مہربان) ہے/ چِت کرے = دھیان کرے۔ سوچے/ پِرم = پریم، پیار/ لوچے = چاہے/ کھسم = مالک، صاحب، خدا/ جے = جسے/ تے = اُسے۔

اے فرید! عمر کالے بالوں کی ہو یا سفید بالوں کی، خدا سدا (مہربان) ہے بشرطیکہ کوئی سوچے۔ یہ پریم یا عشقِ خداوندی اپنے ارادے سے نہیں لگتا اگرچہ سبھی اس کے خواہشمند ہوں گے۔ یہ پریم پیالہ خدا کا اپنا ہے، وہ جسے چاہے اسے دے دیتا ہے۔

روایت ہے کہ یہ تین مصرعوں کا شلوک بابا فرید کا نہیں بلکہ گرو امرداس جی کا ہے۔ پہلے مصرعے میں جو فرید کا نام آیا ہے اُس سے اس مغالطے میں نہیں پڑنا چاہیے کہ اُسے بابا فرید نے خود اپنے لیے تخلص کے طور پر استعمال کیا ہے نہیں، بلکہ یہ گورو امرداس نے انھیں ان کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے اُن کے پچھلے شلوک کے جواب میں کہا ہے۔ پچھلے شلوک میں بابا فرید نے کہا تھا کہ جو لوگ جوانی میں خدا کو یاد نہیں کرتے وہ بڑی عمر میں بھی اسے یاد نہیں کرسکیں گے۔ گرو امرداس جی کہتے ہیں کہ آدمی کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ خدا کی یاد یا محبت ایک نعمت ہے جس کا عمر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نعمت صرف توفیقِ خداوندی سے حاصل ہوتی ہے، خواہ کوئی جوان ہو یا بوڑھا۔ اس نعمت کو "پریم پیالہ" کہا گیا ہے جو محبت کیلئے

ایک معروف استعارہ ہے اس کی موزونیت اس لیے زیادہ ہوگئی ہے کہ پیالہ ہمیشہ دیا جاتا ہے، طلب نہیں کیا جاتا۔

یہ شلوک چونکہ بابا فرید کا نہیں اس لیے ہمیں اس کو "شلوک فرید" کے متن سے الگ کرکے لکھنا چاہیے تھا، لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ گرنتھ صاحب کی تدوین کے وقت گرو ارجن نے اسے گرنتھ میں شامل کر دیا تھا اس لیے اب چار صدی بعد اسے علیحدہ کرکے فٹ نوٹ کے طور پر درج کرنا ہمیں مناسب معلوم نہیں ہوا۔

ਫਰੀਦਾ ਜਿਨ ਲੋਇਣ ਜਗੁ ਮੋਹਿਆ ਸੇ ਲੋਇਣ ਮੈ ਡਿਠੁ ॥
ਕਜਲ ਰੇਖ ਨ ਸਹਿਦਿਆ ਸੇ ਪੰਖੀ ਸੂਇ ਬਹਿਠੁ ॥੧੪॥

۱۴

فریدا جن لوئن جگ موہیا سے لوئن مے ڈِٹھُ
کجل ریکھ نَ سہدیاں سے پنکھی سُوءِ بہِٹھُ

لوئن = آنکھیں / جگ موہیا = دنیا کو فریفتہ کیا / سے = وہ / مے ڈِٹھ = میں نے دیکھا / کجل = کاجل، سُرمہ / کجل ریکھ = تحریرِ سُرمہ، خطِ سُرمہ، خط سرمہ کا بھار / پنکھی = پرندے / سُوئے = بچے دیئے۔ "سُونا" مصدر سے، بمعنی بچے دینا / بہٹھ = بیٹھے۔

اے فرید جن آنکھوں نے (کبھی) ایک دُنیا کو فریفتہ کر رکھا تھا، اُنھی آنکھوں کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ جو (کبھی) نزاکت سے سُرمے کی ریکھا کا بوجھ بھی سہار نہیں سکتی تھیں، (مرنے کے بعد) اُن میں (یعنی اُن کے استخوانی حلقہ ہائے چشم میں) پرندے بچے دیتے بیٹھے ہیں۔

یہ شلوک فریدؒ کے بہترین اشعار میں سے ہے۔ جسم کے حُسن اور اُس کے غرور کا تقابل اس قابلِ رحم حالت سے کیا گیا ہے جس میں موت کے بعد اسی جسم کی آنکھوں کے استخوانی حلقوں میں پرندوں نے آکر انڈے بچے دے دیئے ہیں۔ کہاں وہ شان کہ جگ افسونِ حُسن سے مسحُور ہے اور کہاں یہ بے چارگی کہ کاسہ سر تک شکستہ اور بے توقیر ہو چکا ہے۔ دراصل فریدؒ کے ذہن میں پُرغرور سروں کی شکستگی اور ذلت کا نقشہ بہت گہرا ثبت ہوا ہے، یہاں تک کہ غرور کی وہ رمق جو ان کے اپنے دل میں خود اپنے متعلق دبی ہوئی ہے۔ اسے بھی نہیں بخشتے اور ایک شلوک (۲۶) میں اپنی پگڑی کے میلے یعنی بے توقیر ہو جانے کے خوف کا تقابل "سر بھی مٹی کھائے" کی حالت سے کرتے ہیں۔

"جن لوئن جگ موہیا" اور "کجل ریکھ نہ سہندیاں" کے جملوں کی موزونیت اور اثر انگیزی ایک معجزہ ہے۔ فرید نے جن لوئن کو دیکھا تھا انہوں نے "جگ موہیا" ہو یا نہ ہو لیکن ان کے الفاظ یقیناً دلوں کے جگ کو موہنے والے ہیں؛ اور وہ ساحر آنکھیں "کجل ریکھ" کا بار سہہ سکتی ہوں یا نہ لیکن فرید کے الفاظ اتنے نازک اور موزوں ہیں کہ وہ حرف برابر تبدیلی نہیں سہہ سکتے۔

ਫਰੀਦਾ ਕੂਕੇਦਿਆ ਚਾਂਗੇਦਿਆ ਮਤੀ ਦੇਦਿਆ ਨਿਤ ॥
ਜੋ ਸੈਤਾਨਿ ਵੰਞਾਇਆ ਸੇ ਕਿਤ ਫੇਰਹਿ ਚਿਤ ॥੧੫॥

۱۵

فریدا کُوکیدیا چانگیدیا متی دیدیا نِت
جو سَیتان ونجایا سے کِت پھیرہِ چِت

کُوکیدیاں = بار بار کُوکیں مارتے ہوئے / چانگیدیاں = بار بار چانگاں (چیخیں) مارتے ہوئے، بہ آوازِ بلند خبردار کرتے ہوئے / متّیں دیندیاں = مت (عقل) دیتے ہوئے / نت = ہمیشہ
جو شیطان ونجایا = جسے شیطان نے گمراہ کیا / سے = وہ / کِت = کہاں، کیسے / پھیریں چِت = دِل کو پھیر کر (سیدھی راہ پر لائیں)

اے فرید! (ہم گمراہ ہونے والے کو بار بار) بہ آوازِ بلند کُوک کُوک کر اور چیخ چیخ کر ہمیشہ عقل دیتے رہے، (لیکن) جسے شیطان (یعنی اس کے نفس) نے ہی گمراہ کیا ہو، اس کے دِل (نفسانی خواہشات) کو کیسے پھیر کر (راہِ راست پر لایا جائے؟)۔

بچوں، نوجوانوں اور اخلاقی طور پر ناپختہ لوگوں کو سیدھے راہ کی تعلیم و تربیت دینا ایک نارمل، صحیح اور مفید عمل ہے جو ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے۔ اگر یہ عمل بے کار ہوتا تو نبی اور رسول دنیا میں نہ آتے۔ پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض لوگ اپنے فائدے، انا یا ضد کے لیے سیدھے راستے پر نہیں چلتے۔ انہیں کتنا بھی سمجھایا جائے وہ کج رو ہی رہتے ہیں استعارے کی زبان میں کہا جاتا ہے کہ انہیں شیطان نے غلط راستے پر لگایا ہے اور انہیں سیدھے راستے پر آنے نہیں دیتا۔ بہت سے صوفیہ انسان کے اپنے نفس ہی کو شیطان سمجھتے ہیں اس لیے اس شلوک کا مطلب ہوگا کہ بعض لوگ اپنے نفس کی پیروی میں ہدایت قبول نہیں کرتے۔

ਫਰੀਦਾ ਥੀਉ ਪਵਾਹੀ ਦਭੁ ॥
ਜੇ ਸਾਂਈ ਲੋੜਹਿ ਸਭੁ ॥
ਇਕੁ ਛਿਜਹਿ ਬਿਆ ਲਤਾੜੀਅਹਿ ॥
ਤਾਂ ਸਾਂਈ ਦੈ ਦਰਿ ਵਾੜੀਅਹਿ ॥੧੬॥

١٦

فریدا تھیو پواہی دبھُ
جے سائیں لوڑہِ سبھُ
اک چھجہ بیا لتاڑیاہِ
تاں سائیں دے در واڑیاہِ

تھیو = ہو جاؤ / پواہی = "پہیئے" کی، پگ کی، وہ جو پاؤں کے نیچے آتی رہتی ہے / دبھ = گھاس کی ایک قسم / لوڑیں = ڈھونڈیں، ڈھونڈتے ہو / جے سائیں لوڑیں سبھ = اگر خدا کو ڈھونڈتے ہو سب چیزوں میں / چھجّے = کوٹے ٹکڑے کرے / بیا = دوسرے / لتاڑیئے = لتاڑے، پاؤں سے ملے / درواڑیا = در میں واڑیا یا داخل کیا۔ ایک شارح کے مطابق درواڑیا ایک لفظ ہے جو دربار کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ہم نے پہلے معنوں کو ترجیح دی ہے۔

اے فرید، ہو جاؤ پگڈنڈی کی دبھ (گھاس) اگر خدا کو ڈھونڈتے ہو سب شے میں۔ ایک نے اسے یعنی دبھ کو ٹکڑے کیا دوسرے نے اسے لتاڑا، تب وہ خدا کی درگاہ میں داخل ہوا خدا کو ہر شے میں دیکھنے کا کوئی ایک راستہ نہیں۔ راستے بہت سے ہیں اور ان میں خاکساری اور ضرورتمندوں کی خدمت ایک راستہ ہے۔ پہلی نظر میں تن کے "سبھ" سے مراد ہر شے ہو سکتا ہے اور یہ غلط بھی نہیں۔ لیکن بابا کے زمانے کو دیکھتے ہوئے جب کہ اونچی ذات کے لوگ دوسروں کو اپنے پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتے تھے "جے سائیں لوڑیں سبھ" سے مراد اس زمانے کے لوگوں کو یہ سمجھانا ہو سکتا ہے کہ ہر انسان میں خدا دیکھا جا سکتا ہے خواہ وہ کسی ذات کا بھی کیوں نہ ہو۔ لیکن نیچ ذات والوں کی خدمت کرنے سے اونچی ذات کے لوگ برا سمجھیں گے۔ ایک تمہیں "چھجے" گا اور دوسرا لتاڑے گا، لیکن ان کی یہی ملامت تمہیں خدا کے قریب لے جائے گی۔ دعوے کے لیے جو دلیل اور مثال دی گئی ہے وہ نہایت موزوں ہے۔ مسجد (درگاہ خداوندی) میں جو صف لائی اور بچھائی جاتی ہے وہ اس گھاس (دبھ اور کاہی وغیرہ) سے بنتی ہے جسے ایک کاریگر کوٹتا ہے اور دوسرا لتاڑتا ہے۔ تب اس کی صف بنتی ہے اور وہ مسجد میں رکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ آدمی جو خالصتاً خدا کے لیے دوسروں کی خدمت کرتا ہے خواہ اس میں اسے تکلیف بھی ہو، مقبولِ درگاہِ خداوندی ہو جاتا ہے۔

شاہ حسین نے کہا ہے: ہور وی نیواں ہو وے فقیرا / ہور وی نیواں ہو / پاویں گا دیدار صحب دا / ہور وی نیواں ہو!

بعض مؤلفوں نے اس شلوک کو دو مصرعوں میں لکھا ہے اور بعض نے چار میں۔

ਫਰੀਦਾ ਖਾਕੁ ਨ ਨਿੰਦੀਐ ਖਾਕੂ ਜੇਡ ਨ ਕੋਇ ॥
ਜੀਵਦਿਆ ਪੈਰਾ ਤਲੈ ਮੁਇਆ ਉਪਰਿ ਹੋਇ ॥੧੭॥

۱۷

فریدا کھاکُ نَ نِندیئے کھاکُو جیڈ نَ کوءِ
جیودِیا پَیرا تلے ، مویا اُپرِ ھوءِ

کھاک = خاک، مٹی / نِندیے = نِندنا مصدر سے، بُرا کہیے، حقیر جانیے / جیڈ = جتنا، جیسا / جیونّدیاں = زندگی میں / مویا = مویاں، مرنے پر۔

اے فرید خاک کو بُرا نہ کہیے، خاک جیسا کوئی نہیں۔ (ہماری) زندگی میں (یہ ہمارے) پاؤں تلے (ہوتی ہے، لیکن) مرنے پر ہمارے اوپر ہو جاتی ہے۔

خاکساری ایک انسانی وصف ہے۔ ایسا انسان اپنے آپ کو خاک کی طرح عاجز اور دوسروں کے پاؤں تلے رہنے والا سمجھتا ہے۔ عام لوگ ایسے انسان کو حقیر سمجھتے ہیں لیکن فرید کہتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو حقیر نہ سمجھو کیونکہ یہ خاکسار خاک کی طرح ہیں۔ خاک آج تمہارے پاؤں تلے ہے لیکن کل، جب تم قبر میں ہوگے، تو یہ تمہارے اوپر ہوگی اور پھر ہمیشہ اوپر ہی رہے گی۔ انجیلِ مقدس کی یہ آیت ذہن میں آتی ہے: "مبارک ہیں عاجز انسان کہ وہ زمین کے وارث ہوں گے"

اس شلوک کا مضمون ایک حد تک پچھلے شلوک سے ملتا جلتا ہے۔ وہاں بتایا گیا تھا کہ پاؤں تلے مسلی ہوئی دبھ صف بن کر مسجد جیسی مقدس جگہ میں رکھی جاتی ہے اور یہاں خاک کی عظمت بیان ہوتی ہے۔ دبھ اور خاک دونوں ہی عاجز اور خاکسار لوگوں کی علامت ہیں؛ اور دونوں شلوکوں میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ آخری کامیابی مغرور لوگوں کو نہیں بلکہ عاجزوں کو حاصل ہوتی ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਜਾ ਲਬੁ ਤ ਨੇਹੁ ਕਿਆ ਲਬੁ ਤ ਕੂੜਾ ਨੇਹੁ ॥
ਕਿਚਰੁ ਝਤਿ ਲਘਾਈਐ ਛਪਰਿ ਤੁਟੈ ਮੇਹੁ ॥੧੮॥

۱۸

فریدا جا لبُ تا نیہُ کیا، لبُ تا کوُڑا نیہُ
کچرُ جھتِ لگھایئے چھپرِ تُٹّے میہُ

جا = جہاں، جب / لب = لوبھ، لالچ / نیہ = محبت / کُوڑا = جھُوٹا / کِچر = کتنے چِر تک، کب تک / جھت = وقت، خصوصاً وقت کا وہ مختصر وقفہ جس میں کوئی مشکل یا بُحران آ پڑے۔ اسی سے "جھت لنگھانا" محاورے کے معنی ہوں گے: وقتی مشکل سے اپنے آپ کو گزار لے جانا۔ / لگھایئے = لنگھایئے، گزاریئے / چھپر ٹُٹّے = ٹوٹا چھپر

اے فرید! جہاں لوبھ ہے وہاں محبت کیسی؟ لوبھ ہوگا تو محبت جھوٹی ہوگی۔ کب تک وقت گزارا جا سکے گا ٹوٹے چھپر (کے نیچے) مینہ میں۔

پہلے مصرعے میں جو بات کہی گئی ہے یعنی یہ کہ جس محبت میں لالچ شامل ہو وہ محبت جھوٹی ہوتی ہے، ایک سچائی ہے۔ لیکن دوسرے مصرعے میں جو مثال "لالچ ملی محبت" کے لیے لائی گئی ہے، یعنی ایسا ٹوٹا چھپر جو بارش کو دیر تک روک نہیں سکتا وہ برمحل اور موزوں نہیں معلوم ہوتی۔ ہاں شاید یہ ایک مناسبت ان دونوں میں ہو کہ "لالچ ملی محبت" اور "ٹوٹا چھپر" دیر تک نہیں چل سکتے۔

"چھپر ٹٹّے مینہ" کا جملہ اپنی گرامر کے لحاظ سے محلِ نظر ہے۔ غالباً ایک غیر گرامری اختصار یہاں برتا گیا ہے یعنی کنایہ مقصود تھا "چھپر ٹوٹا ہوا اور مینہ" لیکن صرف "چھپر ٹٹّے مینہ" کہہ کر معنی کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਜੰਗਲੁ ਜੰਗਲੁ ਕਿਆ ਭਵਹਿ ਵਣਿ ਕੰਡਾ ਮੋੜੇਹਿ ॥
ਵਸੀ ਰਬੁ ਹਿਆਲੀਐ ਜੰਗਲੁ ਕਿਆ ਢੂਢੇਹਿ ॥੧੯॥ ۱۹

فریدا جنگلُ جنگلُ کیا بھویہ وݨ کنڈا موڑیہ
وسی ربُ ہیایئےَ جنگلُ کیا ڈھوڈھیہ

بھویں = بھَونا مصدر سے، معنی گھُومنا، سیر و سفر کرنا / وَن = بن یعنی جنگل لیکن یہ ایک خار دار درخت کا نام بھی ہے / وَن کنڈا = صفت موصوف جنگل کا کانٹا یا ون درخت کا کانٹا / موڑیں = پاؤں کے نیچے لاکر موڑتے ہو، مسلتے ہو / وسّی = وسّے، بسے = پنجابی میں "وسّی" مخاطب کے لیے استعمال ہوسکتا ہے، بستا ہے تمہارے (دل میں) / ہیایئےَ = ہیا کے معنی دِل ہوتے ہیں۔ ہیال قیاساً ننھیال اور ددھیال کی طرح کا اسم ہے، اس لیے "ہیایئےَ" سے مراد "دِل کی بستی میں" ہوگا۔

اے فرید! (خدا کی تلاش میں) جنگل جنگل کیا گھُوم پھر رہے ہو اور وَن کے کانٹوں میں چل رہے (یعنی پاؤں زخمی کر رہے ہو)۔ رب تو تمہارے دِل میں بستا ہے؛ اُسے جنگل میں کیا ڈھونڈتے ہو۔

خدا کی تلاش کرنے والے شروع شروع میں عموماً بستیوں سے الگ ہوکر گیان دھیان میں لگتے ہیں۔ لیکن آخر ان پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا اُن سے باہر نہیں بلکہ ان کے دِل ہی میں بستا ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਇਨੀ ਨਿਕੀ ਜੰਘੀਐ ਥਲ ਡੂਗਰ ਭਵਿਓਮ੍ਹਿ ॥
ਅਜੁ ਫਰੀਦੈ ਕੂਜੜਾ ਸੈ ਕੋਹਾਂ ਥੀਓਮਿ ॥੨੦॥ ۲۰

فریدا اینی نکی جنگھیے تھل ڈوگر بھوِ اُمِ
اجُ فریدے کوجڑا سئے کوھاں تھی اُمِ

اینی = اِتنی، اِن / جنگھییَں = ٹانگوں سے / تھل = ریگستان / ڈُونگر = پہاڑ / بھوئُم = میں گھوما پھرا ہُوں / کوجڑا = کُجّا، کوزہ، وضو کا لوٹا / تھیوئُم = ہوگیا ہُوں۔

اے فرید، ان چھوٹی ٹانگوں سے (مَیں دور و دراز) ریگستانوں اور پہاڑوں پر گھوما پھرا ہوں۔ لیکن آج (بڑھاپے میں) میں کوزۂ وضو سے بھی ایک سو کوس دُور ہوگیا ہُوں۔ (یعنی وہی ٹانگیں اب مجھے گھر میں پڑے ہوئے کوزۂ وضو تک بھی نہیں لے جاسکتیں)

یہ واقعہ ہے کہ بابا فریدؒ بڑی عمر کو پہنچے ہیں۔ اس لیے ان کا بڑھاپے کی بیچارگیوں کا بیان بہت سچا اور اثرانگیز ہے۔ ایک وقت جوانی کا وہ تھا جس میں وہ سینکڑوں کوس کی منزلیں ریگستانوں اور پہاڑوں میں پیدل ہی طے کرلیا کرتے تھے۔ لیکن اب بڑھاپے میں یہ وقت آگیا ہے کہ وضو کے لیے اپنے گھر میں پڑے ہوئے لوٹے تک پہنچنا بھی سینکڑوں کوس جیسا کٹھن سفر معلوم ہوتا ہے۔ جوانی اور بڑھاپے کا تقابل نہایت موزوں ذہنی تصویروں سے کیا گیا ہے۔

اس شلوک کا نفسِ مضمون اگرچہ پچھلے شلوک سے پیوستہ نہیں تاہم اُن میں ایک مماثلت ضرور ہے اور ہوسکتا ہے کہ پچھلے شلوک کے جنگل اور بن سے اس شلوک کا مضمون سُوجھا ہو۔

ਫਰੀਦਾ ਰਾਤੀ ਵਡੀਆਂ ਧੁਖਿ ਧੁਖਿ ਉਠਨਿ ਪਾਸ ॥ ۲۱
ਧਿਗੁ ਤਿਨ੍ਹਾ ਦਾ ਜੀਵਿਆ ਜਿਨਾ੍ ਵਿਡਾਣੀ ਆਸ ॥੨੧॥

فریدا راتی وڈِیا دُھکھ دُھکھ اُٹھنِ پاس
دِھرگُ تِنہا دا جیویا جِنہا وِڈانی آس

دھکہ = مصدر دھکنا سے ۔سُلگنا ، جلنا / پاس = پاسا ، پہلو / دِھرگ = غالباً لفظ فارسی دریغ کی پنجابی شکل ہے۔ پھٹکار ، افسوس / جیویا = جیا ہوا زمانہ ، زندگی / وڈانی = بیگانی ، پرائی ۔

اے فرید ! راتیں بڑی (لمبی) ہیں (جن میں سب خواب بیٹھے ہوتے) پہلو جل اٹھتے ہیں ۔ دریغ ہے اُن کا جیا ہوا زمانہ (زندگی) جنھیں پرائی آس ہے ۔

پہلے اور دوسرے مصرعے کا تعلق اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ جو لوگ خود ہمت کر کے اپنے مسائل حل نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی مدد پر آس لگائے رکھتے ہیں وہ راتوں کو بے یقینی اور شکوک کے باعث سو نہیں سکتے اور پہلو بدل بدل کر اپنی راتیں کاٹتے ہیں ۔ بابا فرید ایسے لوگوں کی زندگی پر افسوس کرتے ہیں اور انہیں بالواسطہ ہدایت کرتے ہیں کہ اپنے اور اپنے خدا پر بھروسہ رکھو اور دوسروں سے اُمیدیں نہ باندھو ۔

ਫਰੀਦਾ ਜੇ ਮੈ ਹੋਦਾ ਵਾਰਿਆ ਮਿਤਾ ਆਇੜਿਆ ॥
ਹੇੜਾ ਜਲੈ ਮਜੀਠ ਜਿਉ ਉਪਰਿ ਅੰਗਾਰਾ ॥੨੨॥

۲۲

فریدا جے مَے ہودا واریا مِتا آئیڑیا
ہیڑا جلےَ مجیٹھ جیو اُپرِ انگارا

ہوندا = وہ شے جو حاضر ہو ۔ ماحضر (اِسم) / واریا = چھپایا ہے ۔/ مِتّاں = مِیت کی جمع ، دوست ، سجن / آئڑیاں = آئے ہوئے / ہیڑا = ہیا کی تصغیر ۔ دِلڑی ۔ دِل / مجیٹھ = ایک بیل کی جڑ جو پکّا لال رنگ دیتی ہے (اور بظاہر جلائی بھی جاتی ہے لیکن نہیں معلوم کہ اس کے جلنے میں کیا خاص بات ہے جس کے باعث اسے دوسری جلنے والی چیزوں میں سے چنا گیا ہے) انگار = جلتے ہوئے کوئلے ۔

اے فرید ! اگر میں نے کسی حاضر شے (ماحضر) کو چھپایا ہے آنے والے دوستوں سے ، تو میرا دِل جلے (اس طرح) جیسے کہ مجیٹھ انگاروں پر جلتا ہے ۔

اوپر لکھا فقرہ دعائیہ فارم رکھتا ہے ۔ یعنی اگر میں نے اپنی کوئی شے دوستوں سے چھپائی ہو تو خدا کرے میرا دِل دوزخ کے انگاروں پر جلے ۔ لیکن بعض شارح دوسرے مصرعے کے معنے سیدھے بیان کی فارم میں لکھتے ہیں ، اس طرح : "اگر میں نے دوستوں سے کچھ چھپایا ہے تو میرا دِل جلتا ہے" ۔ ہم نہیں کہہ سکتے کونسے معنی صحیح ہیں ۔ بابا فریدؒ کے زمانے میں "جلے" کے معنی "جلے" تھے یا "جلتا ہے" ؟ کسی شارح نے گرامر کے اس نکتے کی وضاحت نہیں کی ۔

یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ "ہوندا واریا" یعنی "جس شے کو چھپایا ہے" وہ کس نوع کی شے ہے ۔ آیا مال دولت ہے یا اپنے گزشتہ واقعات ہیں جو دوستوں کی نظروں میں کسی کو سبک کر دیں یا وارداتِ قلبی ہیں یا کچھ اَور ؟

ਫਰੀਦਾ ਲੋੜੈ ਦਾਖ ਬਿਜਉਰੀਆਂ ਕਿਕਰਿ ਬੀਜੈ ਜਟੁ ॥
ਹੰਢੈ ਉੰਨ ਕਤਾਇਦਾ ਪੈਧਾ ਲੋੜੈ ਪਟੁ ॥੨੩॥

۲۳

فریدا لوڑَے داکھ بجوریاں کِکر بیجےَ جٹُ
ہنڈَے اُن کتائیدا پیدا لوڑَے پٹُ

لوڑے = ڈھونڈتا ہے ، چاہتا ہے / داکھ = چھوٹا انگور ، انگور / بجوریاں = بجوری کی جمع ۔ باجوڑ کے علاقے سے متعلق جو صوبہ سرحد میں واقع ہے / ہنڈے = پھرتا ہے / اُن = اُون / کتائیدا = کتاتا ہے / پیدھا = پہننا / پیدھا لوڑے = پہننا چاہتا ہے / پٹ = ریشم ۔

اے فرید ! نادان جاٹ ڈھونڈتا ہے فصل باجوڑی انگوروں کی لیکن بیجتا ہے کیکر ۔ (اور یہی جاٹ) پھرتا ہے اُون کتاتا لیکن پہننا چاہتا ہے ریشم !

گندم از گندم بروید جَو ز جَو" کا اصول سمجھا رہے ہیں۔ بتا رہے ہیں کہ

فارم کے مطابق تو شاعر فرید سے خطاب کر رہا ہے لیکن فی الحقیقت فرید لوگوں سے مخاطب ہیں اور اُنہیں "

جو شخص کیکر کا بیج بوئے گا وہ اس سے انگور نہیں لے سکے گا اور جو کھُردری اُون کاتتا ہے وہ نرم ریشم نہیں پہن سکے گا۔ اُون کے ساتھ ریشم کا اور کیکر کے ساتھ انگور کا تقابل ہماری عام بول چال

اور شاعری میں اکثر کیا جاتا ہے مثلاً دیکھیے: "بِگرتے انگور چڑھایا ہر خوشہ زخمایا" میاں محمد بخشؒ

ਫਰੀਦਾ ਗਲੀਏ ਚਿਕੜੁ ਦੂਰਿ ਘਰੁ ਨਾਲਿ ਪਿਆਰੇ ਨੇਹੁ ॥
ਚਲਾ ਤ ਭਿਜੈ ਕੰਬਲੀ ਰਹਾਂ ਤ ਤੁਟੈ ਨੇਹੁ ॥੨੪॥
ਭਿਜਉ ਸਿਜਉ ਕੰਬਲੀ ਅਲਹ ਵਰਸਉ ਮੇਹੁ ॥
ਜਾਇ ਮਿਲਾ ਤਿਨਾ ਸਜਣਾ ਤੁਟਉ ਨਾਹੀ ਨੇਹੁ ॥੨੫॥

۲۵-۲۴

فریدا گلیئے چکڑ دُور گھر نال پیارے نیہُ
چلاں تَ بِھجے کنّبلی رہاں تَ تُٹّے نیہُ
بِھجو سِجھو کنّبلی! الله ورسو میہ!
جاءِ مِلا تِنا سجنا تُٹو ناہی نیہُ

گرنتھ صاحب میں ان چار مصرعوں کو دو شلوک شمار کیا گیا ہے، لیکن مضمون کے اعتبار سے وہ ہمیں ایک شلوک دکھائی دیتا ہے۔ شاید بہتر ہوتا کہ شلوک نمبر ا کی طرح (جت دہاڑے دھن وری.....) انہیں بھی ایک شلوک سمجھا جاتا، لیکن ہم نے گرنتھ صاحب کی تقسیم کو بہر حال حرفِ آخر سمجھا ہے اور اُس ہی کے مطابق انہیں دو علیحدہ علیحدہ نمبر دیے ہیں۔

گلیئے = گلیوں میں / چکڑ = کیچڑ، جو بارش میں ہو جاتا ہے / نیہ = محبت، عشق / کنّبلی، کمبل۔ کمبل لباس ہونے کے علاوہ فقیری کا نشان بھی ہے۔ اس کے بھیگ جانے سے مراد فقیری اور پرہیزگاری کی شہرت پر داغ لگنا بھی ہے اگلے شلوک میں جو پگ کو عزت آبرو کے سمبل کے طور پر برتا گیا ہے وہ یہاں کمبلی کے فقیری کے سمبل ہونے کے خیال کو تقویت دیتا ہے / رہاں = رہوں، رُک جاؤں، نہ چلوں / بِھجو = بِھجو کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک نظر سے بھجو صیغہ امر دکھائی دیتا ہے اور اس کے معنی ہوں گے بھیگو یا بھیگ جاؤ۔ لیکن اکثر شارحین نے اسے صیغہ امر نہیں سمجھا اور اس کے معنی "خواہ بھیگ جائے" لکھے ہیں۔ لیکن ہمیں کوئی ایسا اشارہ یہاں نہیں ملتا جس سے صیغہ امر کی نفی ہوتی ہو، البتہ "اللّٰہ ورسوؔ" میں ہو سکتا ہے کہ وہاں صیغہ امر کا نہ ہو اور اس کے معنی ہوں: (۱) اللّٰہ کرے مینہ اَور برسے (۲) اللّٰہ یہ مینہ اَور برساؤ (۳) "اللّٰہ" محض ایک کلمۂ ندائیہ ہو جو کیفیت کے اظہار کے لیے بے اختیار مُنہ سے نکل گیا ہو / سِجھو = بِھجو کا تابع مہمل ہو سکتا ہے / تِنھاں سجناں = تنھاں جمع کا صیغہ ہے لیکن یہاں واحد کے ادب کے لیے لایا گیا ہے۔ ایک بے بنیاد سی کہانی کے مطابق یہ واحد خواجہ بختیار کاکیؒ ہیں / تُٹو ناہیں = ٹُوٹو نہیں یعنی ٹوٹے نہیں۔

اے فرید گلیوں میں کیچڑ ہے اور اُس محبوب کا گھر جس سے عہدِ وفا (نیہ) بندھا ہے، بہت دُور ہے۔ اگر چلتا ہوں تو میری یہ کمبلی بھیگتی ہے اور اگر نہیں چلتا تو عہدِ وفا ٹوٹتا ہے۔ تو پھر اے کمبلی بھیگو اور بھیگتی چلی جاؤ، اور اے اللّٰہ مینہ برساؤ اور برساتے چلے جاؤ۔ (میرا عزم صادق ہے) میں ضرور اس سجن سے جا کر ملوں گا اور عہدِ وفا کو ٹوٹنے نہیں دوں گا۔

یہ شلوک بابا فریدؒ کے بہترین اشعار میں سے ہے اور جس ڈرامائی انداز سے، باوجودِ خطرات عہدِ وفا کے نباہنے کا ذکر ہوا ہے وہ بے مثل ہے۔ بابا فریدؒ کے شلوک کا پہلا مصرعہ اُن مشکلات کے بیان پر مشتمل ہے جو اکثر عشق کی راہ میں پڑتے ہیں اور جن میں سے ایک عظیم مصیبت معاشرے کے بے درد معترضین کی ملامت ہے تاہم جو عاشق اپنے جذبے میں صادق ہے وہ نہ صرف ملامت کو برداشت ہی کرتا ہے بلکہ وہ مزید ملامت کی آرزو کرتا ہے تاکہ یہ اس کے صِدق پر دلیل بن جائے۔

ਫਰੀਦਾ ਮੈ ਭੋਲਾਵਾ ਪਗ ਦਾ ਮਤੁ ਮੈਲੀ ਹੋਇ ਜਾਇ ॥
ਗਹਿਲਾ ਰੂਹੁ ਨ ਜਾਣਈ ਸਿਰੁ ਭੀ ਮਿਟੀ ਖਾਇ ॥੨੬॥

۲۶
فریدا مَے بھُلاوا پگ دا مت مَیلی ہوءِ جاءِ
گیہلا رُوحُ نَ جانڑ ای سِرُ بھی مِٹی کھاءِ

مَے = میں ،میں کو، مجھے/ بھُلاوا = بھُول ، وہم ،فکر/ مَے بھُلاوا = مجھے فکر تھا/ پگ = پگڑی، دستار/ مت = مبادا، نہ ہو/ گیہلا = بے خبر، غافل/ نہ جان ای = نہیں جانتا ، بھُولا ہُوا ہے/ مٹی = میل ، گرد اور مٹی اصلاً ایک ہی شے ہوتی ہیں۔

میں بھُولا تھا (فکر میں تھا) پگڑی (دنیاوی ساکھ) کے متعلق کہ مبادا یہ (مٹی کی گرد اور مَیل سے یعنی معاصروں کی افواہوں سے) مَیلی ہو جائے۔ لیکن میری رُوح اس حقیقت سے غافل تھی کہ مٹی ایک دِن سر کو بھی (جو پگڑی سے کہیں زیادہ اہم شے ہے) کھا جائے گی۔

یہ شلوک بطور شعر بہت اثر انگیز ہے۔ مضمون بلند رکھتا ہے اور اس کے بیان کو تقابل کی صنعت سے نہایت درجہ موثر بنایا ہے۔ ایک تقابل پگڑی اور سر کا ہے اور ایک مَیل اور مٹی کا۔ پگڑی دنیاوی ساکھ کا سمبل ہے جسے انسان بہت سنبھال سنبھال کر گرد سے (یعنی معاصروں کی افواہوں سے) بچائے رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ مگر یہ ساکھ ایک سراب اور مایا ہے۔ ساکھ جیسی خیالی شے کے مقابلے میں سر (یعنی جان) ایک ٹھوس شے ہے لیکن مٹی وہ دشمن ہے کہ اِسے تک کو کھا جائے گی۔ ایک طرف مصنوعی معاشرے (پگ) کا عمل اور ردِ عمل ہے اور دوسری طرف قانونِ قدرت (مٹی) کا چلن ہے جو اس سے کہیں ظالم ہے۔ پگڑی اور سر اور مَیل اور مٹی متصل ہوتے ہیں۔ لیکن شاعر نے اُن میں تقابل (کنٹراسٹ) پیدا کر کے مضمون میں جان ڈال دی ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਸਕਰ ਖੰਡੁ ਨਿਵਾਤ ਗੁੜੁ ਮਾਖਿਉ ਮਾਝਾ ਦੁਧੁ ॥
ਸਭੇ ਵਸਤੂ ਮਿਠੀਆਂ ਰਬ ਨ ਪੁਜਨਿ ਤੁਧੁ ॥੨੭॥

۲۷
فریدا سکر کھنڈُ نِوات گڑُ ماکھیو ماجھا دُدھُ
سبھے وستوُ مِٹھیاں، رب نہ پجُنِ تُدھُ!

نوات = نبات ، مصری/ ماکھیوں = شہد کی مکھی کا پیدا کردہ شہد/ ماجھا = مجھ کا ، بھینس کا/ وستو = وست کی جمع ، چیزیں/ پجُن = پہنچیں ، پہنچتی ہیں/ تدھ = تو، تم۔
(شک نہیں کہ) شکر، کھانڈ، مصری، گڑ، شہد اور ماجھا دُودھ ، یہ سب چیزیں میٹھی ہیں لیکن اے رب یہ تیرے نام کی مٹھاس کو نہیں پہنچتیں۔

مطلب واضح ہے اور محتاج تشریح نہیں۔

ਫਰੀਦਾ ਰੋਟੀ ਮੇਰੀ ਕਾਠ ਕੀ ਲਾਵਣੁ ਮੇਰੀ ਭੁਖ ॥
ਜਿਨਾ ਖਾਧੀ ਚੋਪੜੀ ਘਣੇ ਸਹਨਿਗੇ ਦੁਖ ॥੨੮॥

۲۸
فریدا روٹی میری کاٹھ کی لاونڑ میری بھُکھ
جنھا کھادی چوپڑی گھنے سہنڑ گے دُکھ

کاٹھ = لکڑی/ لاون = سالن/ گھنے = بہت

میری روٹی لکڑی کی ہے اور میری بھوک ہی اس کا سالن ہے۔ جنھوں نے چپڑی روٹی کھائی اُنہیں (آگے چل کر) بہت دُکھ سہنے پڑیں گے۔

روٹی اگر خشک ہو تو بغیر سالن کے (جو اسے حلق سے نیچے اتارنے میں مدد دیتا ہے) نہیں کھائی جا سکتی۔ یہاں روٹی لکڑی جیسی خشک ہے یعنی بہت ہی خشک۔ لیکن سالن پھر بھی موجود نہیں۔ اسے حلق سے نیچے اتارنے کے لیے سالن کی جگہ صرف زہد و تقشف کے متواتر فاقوں کی بھوک ہے اور بس۔ پنجابی کی ایک مثل ہے "بُھکھ نہ پُچھیا سالنا تے عشق نہ پُچھی ذات" لیکن ایک روایت کے مطابق بابا فریدؒ کی "روٹی" سچ مچ لکڑی ہی کی تھی جسے وہ بھوک کے دوروں میں چبانے سے تسکین حاصل کیا کرتے تھے اور جسے اب تک فرید کوٹ میں لوگوں کو دکھانے کے لیے محفوظ کر کے رکھا گیا ہے۔ پھر بابا یکایک ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو عیش کی زندگی بسر کر رہے ہیں یعنی وہ جو "تِنھاں کھادی چوپڑی" کے مصداق ہیں وہ بتاتے ہیں کہ ان لوگوں کو آگے چل کر بہت عذاب سہنا پڑے گا۔ زمانہ یکساں نہیں رہتا۔ دفعتاً اسبابِ عیش چھن جاتے ہیں تو ایسے لوگوں کو جو تکلیف اٹھانی پڑتی ہے وہ تنگدستی کے خوگر لوگوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ پھر ایک اور نظر سے دیکھیں تو دنیا کے عیش (کل بھی اور آج بھی) بے انصافی ہی سے ملتے ہیں۔ کثیر تعداد لوگ تنگدست رہیں تو ایک شخص خوشحال ہوتا ہے۔ اس شخص کو ہر وقت اسبابِ عیش کے چھن جانے کا خوف رہتا ہے جو ایک بڑا عذاب ہے۔ یہ نہ بھی ہو تو اسے اپنے اِردگرد کے غریبوں کو دیکھ کر ضمیر کی ملامت تو سہنی پڑتی ہے۔ یہ بھی عذاب ہے۔

ਰੁਖੀ ਸੁਖੀ ਖਾਇ ਕੈ ਠੰਢਾ ਪਾਣੀ ਪੀਉ ॥
ਫਰੀਦਾ ਦੇਖਿ ਪਰਾਈ ਚੋਪੜੀ ਨਾ ਤਰਸਾਏ ਜੀਉ ॥੨੯॥

۲۹
رُکھی سُکھی کھاءِ کےَ ٹھنڈا پانی پیءُ
فریدا دیکھ پرائی چوپڑی نا ترسائے جیءُ

رُوکھی سوکھی اور چوپڑی، یہ تینوں روٹی کی صفات ہیں اگرچہ روٹی کا نام نہیں لیا گیا۔ پچھلے متصلہ شلوک میں البتہ روٹی بالوضاحت مذکور ہوئی ہے۔ تاہم "رُکھی سُکھی" سے مراد صرف روٹی نہیں بلکہ پُوری زندگی کے سادہ طریق سے ہے۔ اسی طرح چوپڑی سے مراد صرف گھی لگی روٹی نہیں بلکہ پُرعیش زندگی بھی ہے۔

رُوکھی سُوکھی روٹی کھا کر اور ٹھنڈا پانی پی کر گزارا کرو اور غیروں کی چوپڑی روٹی دیکھ کر جی کو نہ ترساوَ۔

اس شلوک کی زبان تعجب انگیز طور پر آج کل کے زمانے کی اور سلیس ہے۔ مضمون بہت سادہ ہے اور محتاجِ تشریح نہیں۔ اپنی تھوڑی (حلال کی) کمائی پر قناعت کرنے اور دوسروں کی شان و شوکت دیکھ کر جی نہ ترسانے کی تلقین کی گئی ہے۔ ٹھنڈا پانی تک خدا کی بڑی عطا ہے۔ شاہ حسین فرماتے ہیں : اُچا پِّل جھاٹلا کھوہی ٹھنڈا نیر۔ ربّ نے آپ نوا جیا شاہ حسین فقیر

ਅਜੁ ਨ ਸੁਤੀ ਕੰਤ ਸਿਉ ਅੰਗੁ ਮੁੜੇ ਮੁੜਿ ਜਾਇ ॥
ਜਾਇ ਪੁਛਹੁ ਡੋਹਾਗਣੀ ਤੁਮ ਕਿਉ ਰੈਣਿ ਵਿਹਾਇ ॥੩੦॥

۳۰
اج نَ سُتی کنّت سیو انگُ مُڑے مُڑِ جاءِ
جاءِ پُچھُہ ڈوھاگنی تمُ کِیو رَینٹ وِھاءِ

کنت = خاوند، محبوب / سیوں = سے، ساتھ / سُتی کنت سیوں = کنت سے نہیں سوئی یعنی کنت کے ساتھ نہیں سوئی / انگ = جسم، اعضا / مُڑے مُڑ جائیں مُڑ مُڑ جاتے ہیں / ڈوہاگنی = ڈوہاگن جو سہاگن کا اُلٹ ہے، چُھٹڑ، طویل عرصے سے مبتلائے ہجر عورت / کیو = کویں، کس طرح / وہاءِ = وہانا مصدر سے مشتق، گزارنا، گزارتی ہو۔

میں (صرف) آج ہی اپنے محبوب کے ساتھ نہیں سوئی تو (یہ حال ہوا ہے کہ) میرے اعضا مُڑ مُڑ جاتے ہیں (یا، بدن ٹوٹا جا رہا ہے)۔ پھر کوئی جا کر اُس سہاگ لُٹی بے نصیب عورت سے پُوچھے کہ تم اپنی (تنہائی کی) راتیں کس طرح گزارتی ہو۔

بابا فریدؒ کا محبوب کے ساتھ سونے کی طرف ایسا کھلا اشارہ کرنا اکثر شارحین کو شاق گزرا ہے۔ چنانچہ وہ مجاز کو صرفِ نظر کرتے ہوئے اس سے بندے اور ربّ کا وصال مراد لیتے

میں خیرالیے متقی پرہیزگاروں کا ذوق جیسا بھی ہو ہمیں تو اس شلوک کے لفظی مفہوم میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ آخر اس کا نتیجہ ایک دوسری ہم نصیب عورت سے ہمدردی ہی تو ہے۔ ایک عورت کو (فرید بہت کم اپنے لیے مونث کا صیغہ برتتے ہیں لیکن یہاں برتا ہے) محبوب سے ایک رات کی جدائی نے دوسری کے غم کا احساس دلایا ہے جو اونچے اخلاق کا غماز ہے۔
پھر اس شلوک کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک عورت اپنے آپ ہی سے مخاطب ہے اور سوچ رہی ہے کہ اگر ایک رات کی جدائی یہ حال کر سکتی ہے تو طویل عرصے کا فراق کیا نہ کرے گا۔

ਸਾਹੁਰੈ ਢੋਈ ਨਾ ਲਹੈ ਪੇਈਐ ਨਾਹੀ ਥਾਉ ॥
ਪਿਰੁ ਵਾਤੜੀ ਨ ਪੁਛਈ ਧਨ ਸੋਹਾਗਣਿ ਨਾਉ ॥੩੧॥

۳۱
ساہرے ڈھوئی نا لہے پیئیے ناہی تھاؤ
پر واتڑی ن پچھئی دھن سہاگن ناؤ

ڈھوئی = آسرا، سہارا / لہے = ملتی، ملتا (اکثر شارحین نے لہے کے معنی "لے" لکھا ہے جو بظاہر لہے ہی کی دوسری شکل ہے۔ اس سے "ساہرے ڈھوئی نہ لہے" کے معنی ہوں گے "وہ سسرال میں آسرا نہیں لیتی" لیکن سب نے اس کا ترجمہ "اسے سسرال میں آسرا نہیں ملتا" کیا ہے جو ہے تو معقول لیکن متن کے الفاظ سے پیدا نہیں ہوتا۔ صرف ڈاکٹر سریندر سنگھ کوہلی نے "لہے" کا ترجمہ "ملدا" لکھا ہے لہذا اس ہی کے یہاں متن کے الفاظ اور معنوں میں تصادم نہیں / تھاؤں = جگہ / پر = محبوب، خاوند / واتڑی = وات یا بات کی تصغیر، ذرا سی بات / دھن = عورت، لیکن یہ طنزیہ کلمہ بھی ہو سکتا ہے = ماشاءاللہ! دھن ہے!

سسرال میں اسے سہارا نہیں ملتا اور میکے میں (اس کے لیے) کوئی جگہ نہیں، خاوند بات نہیں پوچھتا اور اس (عورت نے) نام رکھا ہے "سہاگن"۔ دھن ہے!
مرکزی خیال تو دوسرے مصرعے ہی میں ہے یعنی وہ کیا خاک سہاگن ہے جسے اُس کا خاوند پوچھتا تک نہیں۔ پہلے مصرعے کو اس مرکزی خیال کے گرد کا حاشیہ سمجھنا چاہیے جہاں میکا اس دنیا کے لیے بطور سمبل استعمال ہوا ہے اور سسرال اگلے جہان کے لیے۔ اس شلوک میں مجموعی طور پر ایسے انسان کا ذکر ہے جو ہر طرف سے بے نصیب ہے کیونکہ خدا نے اس سے منہ موڑ رکھا ہے۔

ਸਾਹੁਰੈ ਪੇਈਐ ਕੰਤ ਕੀ ਕੰਤੁ ਅਗੰਮੁ ਅਥਾਹੁ ॥
ਨਾਨਕ ਸੋ ਸੋਹਾਗਣੀ ਜੁ ਭਾਵੈ ਬੇਪਰਵਾਹ ॥੩੨॥

۳۲
ساہُرے پئیئے کنت کی کنتُ اگمُ اتھاہ
نانک سو سوہاگنڑ جُ بھاوے بے پرواہ

پئیئے = اس کا تلفظ "پئی اے" ہوگا، معنی میکے / اگمُ = پہنچ سے باہر / اتھاہ = جس کی تہ نہ ہو، نہایت گہرا / اگم اتھاہ = بے حد اونچائی اور گہرائی والا مراد ہے ہر بُعد میں، یعنی بُعد مکان اور بُعد زمان میں لامحدود۔ بلکہ دوسری Dimension. میں بھی آزاد، مثلاً وہ ہم بندوں کے اقدارِ اخلاق کا پابند نہیں ہے کہ نیک عمل والوں ہی کو نیک صلہ دے۔ وہ بے پرواہ ہے جس پر چاہے کرم کرے۔
سسرال میں یا میکے میں عورت اپنے مالک ہی کی رہتی ہے اور مالک ہر سمت میں لامحدود ہے۔ اے نانک سہاگن دراصل وہی ہے جو اس بے پرواہ کو بھا جاوے (خواہ وہ میکے میں ہو یا سسرال میں)۔
یہ شلوک بابا فریدؒ کا نہیں بلکہ بابا نانک کا ہے اور یہ انہوں نے پچھلے شلوک کے جواب میں کہا ہے۔ میکے اور سسرال (اس جہان اور اگلے جہان) کو جو اہمیت فرید نے دی تھی نانک اسے کم کرتے ہیں لیکن اس بات میں دونوں متفق ہیں کہ اصل شے مالک کی نظرِ کرم ہے، بندے کی ظاہری حالت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

معمولی لفظی تغیر کے ساتھ یہ شلوک ایک اور جگہ بھی گرنتھ صاحب میں وارد ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مضمون کی مناسبت کے باعث گرو گرنتھ کی تالیف کرنے والوں نے اسے یہاں دوبارہ درج کرنا مناسب سمجھا ہو۔

ਨਾਤੀ ਧੋਤੀ ਸੰਬਹੀ ਸੁਤੀ ਆਇ ਨਚਿੰਦੁ ॥
ਫਰੀਦਾ ਰਹੀ ਸੁ ਬੇੜੀ ਹਿੰਙੁ ਦੀ ਗਈ ਕਥੂਰੀ ਗੰਧੁ ॥੩੩॥

۳۳
ناتی دھوتی سنّبہی سُتی آءِ نِچِنّدُ
فریدا رہی سُ بیڑی ہِنگُ دی گئی کتھُوری گنّدھُ

سنّبہی = سجی، سنگاری / نچند = نچنت، بے فکر / سُو = ہے۔ مثال دیکھیے: لئے پھرتی سُو بُلبل چونچ وِچ گُل شہیدِ ناز کی تُربت ڈھونڈتے سُو
بیڑی = بیڑی (پنجابی)۔ لتھڑی / کتھوری = کستوری / گندھ = سُگندھ، خوشبو۔
نہائی دھوئی اور سنگاری ہوئی بے فکر سوئی ہے۔ لیکن اے فرید (کچھ دیر بعد) لتھڑی ہوئی ہینگ رہ گئی اور کستوری کی خوشبو چلی گئی۔
شارحین نے اس شلوک کی شرح دو بالکل مختلف طرزیں کی ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ نہا دھو کر سنگار کرنے سے مراد دکھاوے کے گُنوں یعنی اعمال ظاہر کی سجاوٹ ہے اور نچنت سونا سے مراد دل کی غفلت یا اس کا مردہ ہونا ہے وہ بتلاتے ہیں کہ آخر کار ظاہری اعمال کی چمک دمک اور خوشبو ختم ہو جاتی ہے اور آگے چل کر دل کا مردہ ہونا گُنوں کو بھی اوگنوں میں بدل دیتا ہے اور گویا خوشبو کی بجائے بدبُو اٹھنے لگتی ہے۔ بعض دوسروں نے لکھا ہے کہ نہائی دھوئی اور نچنت سوئی ہوئی دراصل ایک انسانی میت ہے جسے کافور میں اور دوسری خوشبوؤں میں بسا کر عمدہ ترین کپڑے کے کفن میں لپیٹا گیا ہے۔ لیکن موت کا قدرتی تقاضا پُورا ہو کر رہتا ہے اور جسم کے سڑنے گلنے سے جو بدبُو پیدا ہوتی ہے وہ کافور کی خوشبو پر غالب آجاتی ہے۔
جیسا کہ ہم نے اور جگہ بھی کہا ہے موت اور اس کے بھیانک نتیجے بابا فریدؒ کا خاص موضوع ہیں۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ یہ شلوک کہتے وقت اُن کے ذہن میں آخرالذکر خیال سب سے اُوپر ہو۔

ਜੋਬਨ ਜਾਂਦੇ ਨਾ ਡਰਾਂ ਜੇ ਸਹ ਪ੍ਰੀਤਿ ਨ ਜਾਇ ॥
ਫਰੀਦਾ ਕਿਤੀਂ ਜੋਬਨ ਪ੍ਰੀਤਿ ਬਿਨੁ ਸੁਕਿ ਗਏ ਕੁਮਲਾਇ॥੩੪॥

۳۴
جوبن جانڈے نا ڈراں جے سُہہ پریت نَ جاءِ
فریدا کتیں جوبن پریت بنُ سُک گئے کُملاءِ

نہ = گرو گرنتھ کے ایک ہی مصرعے میں نہ دو شکلوں میں املا ہوا ہے نا اور نَ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا باعث غالباً پہلے کاتب کا سہو ہے / شوہ پریت = وہ محبت جو محبوب اپنے چاہنے والوں پر صرف کرے / کتیں جوبن = کتنی جوانیاں یعنی مبتلائے عشق جوان انسان / سُک گئے کُملا = مرجھانے کے بعد سُوکھ گئے۔
میں جوبن اور جوانی کے گزر جانے سے نہیں ڈرتا اگر آقا کی محبت بھی میری طرف سے نہ پھر جائے۔ اے فرید بہت سی جوانیاں اسی محبت کے نہ ملنے سے کُملا کر سوکھ گئی ہیں۔
انسان نے جب سے شعور ذات پایا ہے اسے وقت کے گزرتے چلے جانے اور بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی منزلوں سے نکل کر اپنی ذات کے موت میں مٹ جانے کا زہرناک احساس دامن گیر رہا ہے۔ اس زہر کا واحد تریاق محبت ہے اگر محبت زندہ ہے تو موت میں کالعدم ہو جانے کا خوف انسان کو نہیں رہتا۔ جوانی کا جوش و خروش چاہے ختم ہو جائے بڑھاپے کی تکلیفیں آگھیریں اور موت جسم کے سب دروازوں پر دستک دینے لگے لیکن محبت کرنے والے انہیں خاطر میں نہیں لاتے اور صرف شوہ اور شوہ پریت ہی کی بقا چاہتے ہیں۔
؏ عشق را نازم کہ بُودش را غمِ نابُودنے (اقبال)

ਫਰੀਦਾ ਚਿੰਤ ਖਟੋਲਾ, ਵਾਣੁ ਦੁਖੁ, ਬਿਰਹਿ ਵਿਛਾਵਣ ਲੇਫੁ ॥
ਏਹੁ ਹਮਾਰਾ ਜੀਵਣਾ ਤੂ ਸਾਹਿਬ ਸਚੇ ਵੇਖੁ ॥੩੫॥

۳۵
فریدا چِنت کھٹولا وانڑ دُکھُ بِرہِ وِچھاونڑ لیفُ
ایہہُ ھمارا جِیُونا تُو صاحِب سچے ویکھُ

چِنت = چِنتا، سوچ، فکر/ کھٹولہ = کھاٹ، چارپائی/ وان = بان/ لیف = لحاف، رضائی/ صاحب سچے = خدا۔
فکر ہماری کھاٹ اور دُکھ (ہماری کھاٹ کا) بان اور فراق ہمارے بچھانے کا لحاف ہے۔ یہ ہے ہمارا جینا، اے سچے خدا تو زرا ہماری یہ حالت دیکھ۔
محبوب کو اپنے دکھ درد سنانا شاعروں کی پُرانی ریت ہے چنانچہ فریدؒ بھی اس شلوک میں یہی کر رہے ہیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ کھاٹ اور لحاف وغیرہ وہ سامان ہیں جن میں آدمی انتہائی آرام اور سکون میں ہوتا ہے لیکن فراقِ محبوب میں یہی چیزیں دُکھ کا احساس بڑھا دیتی ہیں۔

ਬਿਰਹਾ ਬਿਰਹਾ ਆਖੀਐ ਬਿਰਹਾ ਤੂ ਸੁਲਤਾਨੁ ॥
ਫਰੀਦਾ ਜਿਤੁ ਤਨਿ ਬਿਰਹੁ ਨ ਊਪਜੈ ਸੋ ਤਨੁ ਜਾਣੁ ਮਸਾਣੁ॥੩੬॥

۳۶
بِرھا بِرھا آکھیے بِرھا تُو سُلطانُ
فریدا جِتُ تنِ بِرہُ نَ اُوپجے سو تنُ جانڑُ مسانُ

برہا = برہ، فراق، ہجر، یہاں عشق بھی مراد ہو سکتا ہے کیونکہ برہ کا احساس عشق کے بغیر نہیں ہوتا/ سلطان = حاکم، سب سے زیادہ قدر و قیمت والی شے/ تن = جسم، تن اور من یعنی انسان/ اُپجے = اُبھرے، پیدا ہو/ مسان = وہ جگہ جہاں مُردے جلائے جاتے ہیں، قبرستان، یہاں مُراد ہے مُردہ دِل انسان۔
لوگ فراق فراق کہتے ہیں، یعنی فراق کو نام دھرتے ہیں، لیکن درحقیقت فراق سُلطان (نہایت بلند قدر شے) ہے۔ جس تن یعنی انسان میں احساسِ فراق نہیں پیدا ہوتا اسے مسان ہی جانو۔ فراق کو اکثر بُرا کہا جاتا لیکن فراق کا احساس صرف اسے ہو سکتا ہے جسے کبھی وصل حاصل تھا۔ صوفیوں کا ایک بڑا مفروضہ یہ ہے کہ رُوحِ انسانی دراصل رُوحِ خداوندی سے ہی نکلی ہے، اس لیے اگر کسی میں احساسِ فراق اُبھرتا ہے تو یہ اس بات کی نشانی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ رُوحِ کُل سے ہی الگ ہوا ہوا ایک جُزو ہے، اور یہ احساس بڑا قابلِ قدر ہے۔ جسے یہ احساس نہیں وہ مردہ دِل ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਏ ਵਿਸੁ ਗੰਦਲਾ ਧਰੀਆਂ ਖੰਡੁ ਲਿਵਾੜਿ ॥
ਇਕਿ ਰਾਹੇਦੇ ਰਹਿ ਗਏ ਇਕਿ ਰਾਧੀ ਗਏ ਉਜਾੜਿ ॥੩੭॥

۳۷
فریدا اے وِسُ گنّدلا دھریاں کھنّڈُ لِواڑِ
اِک راھیدے رہ گئے اِک رادھی گئے اُجاڑِ

وِس = بس، زہر/ گندل = ایسی نرم شاخ جو کھائی جاتی ہے، مثلاً سرسوں کی گندل/ وِس گندلاں = زہریلی گندلیں/ دھریاں = دھری ہیں/ کھنڈ لواڑ = کھانڈ سے بھڑیں، کھانڈ میں لپٹیں/ راہیندے = روہن مصدر سے، بیجتے، بیجائی کرتے/ رادھی = بیجی ہوئی کھیتی/ گئے اجاڑ = اجڑی دنیا یعنی موت کی دنیا میں چلے گئے۔
اے فرید! یہ زہریلی "گندلیں" ہیں جو کھانڈ میں لپیٹ کر تمہارے سامنے دھری ہیں۔ ایک (وہ لوگ تھے) جو انہیں کاشت کرنے ہی میں اپنا زندگی کا سارا وقت صرف کر گئے اور ایک بیجی ہوئی تیار فصل کو چھوڑ کر خود اُجاڑ میں (موت کے منہ میں) چلے گئے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ "کھنڈ واڑی وِس گندیں" دنیا اور دنیا کی دل فریبیاں ہیں جو آخر کار انسان کو روحانی طور پر تباہ کر دیتی ہیں۔ مقامِ عبرت یہ ہے کہ بعض لوگ ساری عمر دنیا حاصل کرنے کی کوششوں میں لگا دینے کے باوجود اسے پُوری طرح حاصل نہیں کر پاتے اور بعض دوسرے ایسے ہیں کہ وہ اسے حاصل کر کے اجاڑ کی طرف چل دیتے ہیں یعنی بہرحال اسے چھوڑ دیتے ہیں "رادھی گئے اُجاڑ" کے معنی سمجھنے مشکل ہیں۔ پہلی نظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "حاصل فصل کو دوسری قسم کے لوگوں نے اُجاڑ دیا" لیکن فرید یہ کہنا تو نہیں چاہتے ہوں گے۔ وہ تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں انسان ہی برباد ہوتا ہے۔ حفیظ جالندھری مرحوم کا ایک شعر ہے جو تقریباً یہی خیال ظاہر کرتا ہے: ناکامیٔ عشق یا کامیابی دونوں کا حاصل خانہ خرابی

ਫਰੀਦਾ ਚਾਰਿ ਗਵਾਇਆ ਹੰਢਿ ਕੈ ਚਾਰਿ ਗਵਾਇਆ ਸੰਮਿ ॥
ਲੇਖਾ ਰਬੁ ਮੰਗੇਸੀਆ ਤੂੰ ਆਹੋਂ ਕੇਰੇ ਕੰਮਿ ॥੩੮॥

۳۸

فریدا چار گوائِیا ہنڈھِ کے چار گوائِیا سمِ
لیکھا ربُ منّگیسیا توُں آھوں کیھرے کمِ

چار = مراد ہے چار پہر۔ پُرانے تقسیم اوقات کے مطابق دن رات میں آٹھ پہر ہوتے ہیں۔ اس لیے پہلے چار سے مراد دن کے چار پہر اور دوسرے چار سے مُراد رات کے چار پہر ہیں۔ لیکن ایک مشکل یہاں یہ ہوگی کہ "گوائیاں" صیغۂ مؤنث ہے اور "پہر" مذکر۔ شاید فریدؒ کے زمانے میں "پہر" کو مؤنث لکھتے ہوں اور پہر کی جمع "پہریں" کرتے ہوں۔ گوائیاں = گنوائیں، ضائع کیں / ہنڈھ کے = چل پھر کے، آوارہ گردی کر کے / سم = سو کر / لیکھا = حساب کتاب / منگیسیا = مانگے گا / توں آیوں = تو آیا تھا۔ لیکن اگر خدا بندے کا حساب کتاب اگلے جہان میں لے رہا ہے، جیسا کہ عام تصوّر ہے، تو پھر آیوں کی جگہ گییَوں (دنیا میں گئے تھے یا بھیجے گئے تھے) زیادہ فصیح ہوتا۔

دن کے چار پہر گنوائے چل پھر کے (یعنی دنیا کے کاموں میں) اور رات کے چار پہر گنوائے سو کر (خوابِ غفلت میں) پھر جب خدا (تم سے) حساب مانگے گا (اور پوچھے گا کہ) تو کس کام کے لیے (دنیا میں) آیا تھا (تو تو کیا جواب دے گا)۔

بابا فریدؒ کے نزدیک اس جہان میں انسان کا اصل کام خدا کی معرفت حاصل کرنا اور اس کی عبادت کرنا ہے۔ اس لیے وہ وقت جو ضرورت سے زیادہ دنیاوی سامان کے اکٹھے کرنے میں اور عیش آرام کرنے میں گزرتا ہے محض اکارت جاتا ہے اور بندہ اس کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہوگا۔

ਫਰੀਦਾ ਦਰਿ ਦਰਵਾਜੈ ਜਾਇ ਕੈ ਕਿਉ ਡਿਠੋ ਘੜੀਆਲੁ॥
ਏਹੁ ਨਿਦੋਸਾ ਮਾਰੀਐ ਹਮ ਦੋਸਾ ਦਾ ਕਿਆ ਹਾਲੁ ॥੩੯॥

۳۹

فریدا درِ درواجے جاءِ کے کیو ڈِٹھو گھڑئیالُ
ایہہُ نِدوسا مارِیئے ہم دوساں دا کیا حالُ

در دروازے = دروازے کے در پر؟ در اور دروازہ ہم معنی لفظ ہیں اس لیے در دروازے کے پُورے طور پر صحیح معنی سمجھ نہیں آئے۔ البتہ ڈھیلے ڈھالے معنی دَر دَر ہو سکتے ہیں یعنی بہت دروازوں پر / کیو = کیسا / کیو ڈِٹھو = کیسا دیکھا تم نے؛ کیسا حال دیکھا تم نے / گھڑیال = گھڑیاں بتانے والا آلہ۔ عموماً یہ ایک پیتل کا تھال ہوتا ہے جو ہوا میں ٹنگا رہتا ہے اور جس پر لکڑی کی ہتھوڑی سے ہر گھڑی گزرنے پر چوٹ لگائی جاتی ہے جس سے آواز پیدا ہوتی ہے اور دُور دُور تک خبر ہو جاتی ہے کہ ایک گھڑی پُوری ہو گئی۔ / ندوسا = نردوش بے گناہ / دوساں = قرینے سے تو اس کا مفہوم یہاں دوس والا یا گنہگار ہی ہوگا لیکن صحیح معنی صرف گناہ ہیں۔ "ہم دوس" بھی کوئی مرکب گنہ گار کے معنوں میں نہیں سنا گیا۔ شاید یہ لفظ "دوسیاں" ہو جو دوسی (گنہ گار) کی جمع ہے۔

در درجا کے دیکھا کیسا حال ہے گھڑیال کا؟ جب یہ نردوش مارا (پیٹا) جاتا ہے تو ہم گنہ گاروں کا حال کیا ہوگا (مراد یہ کہ ہمیں تو سخت ترین سزا ملے گی)۔

ਘੜੀਏ ਘੜੀਏ ਮਾਰੀਐ ਪਹਰੀ ਲਹੈ ਸਜਾਇ ॥
ਸੋ ਹੇੜਾ ਘੜੀਆਲ ਜਿਉ ਡੁਖੀ ਰੈਣਿ ਵਿਹਾਇ ॥੪੦॥

۴۰
گھڑیے گھڑیے ماریئے پہری لہے سجاء
سو ہیڑا گھڑیال جیو ڈکھی رین وہاء

گھڑیئے گھڑیے = گھڑی گھڑی بعد/ ماریے = مار پڑتی ہے؛ پٹائی ہوتی ہے/ پہریں = پہر پہر بعد۔ پہروں/ سو = یُوں ہی، ایسے ہی/ ہیڑا = دِل/ جیوں = جیسا/ رَین = رات/ وہاء = گزارے ہے۔

ہر گھڑی گزرنے پر (گھڑیال کو) پیٹا جاتا ہے اور وہ پہر پہر پر سزا پاتا ہے۔ یُوں ہی دِل بھی گھڑیال جیسا ہے اور دُکھ سہتے ہُوئے رات گزارتا ہے۔

جنہوں نے کبھی شب ہجر کی خاموشی میں گھڑیال بجنے کی آواز سُنی ہے انہوں نے محسوس کیا ہوگا گویا چوٹ گھڑیال پر نہیں بلکہ دل پر پڑی ہے۔ عاشق گھڑیال سے مخاطب ہوکر کہہ رہا ہے کہ تُمھی مُبتلائے درد نہیں ہو، ہمارے دِل پر بھی درد کی چوٹیں بار بار پڑ رہی ہیں اور یوں ہی ہماری ساری رات بیتے گی۔

ਬੁਢਾ ਹੋਆ ਸੇਖ ਫਰੀਦੁ ਕੰਬਣਿ ਲਗੀ ਦੇਹ ॥
ਜੇ ਸਉ ਵਰ੍ਹਿਆ ਜੀਵਣਾ ਭੀ ਤਨੁ ਹੋਸੀ ਖੇਹ ॥੪੧॥

۴۱
بُڈھا ھوآ سیکھ فریدُ کنّبن لگی دیہہ
جے سَو ورھیا جیونا بھی تن ھوسی کھیہہ

دیہہ = (مونث) جسم/ بھی = پھر بھی/ کھیہ = خاک، راکھ

شیخ فریدؒ بوڑھا ہوگیا اور اس کے بدن میں رعشہ پڑ گیا۔ وہ اگر سو برس بھی جی لے تو آخر کار (اسے موت آئے گی اور) اس کا یہ تن مٹی ہوجائے گا۔

بابا فریدؒ کی پنجابی شاعری میں بڑھاپے کی تکلیفوں اور موت کا موضوع سب سے زیادہ بیان ہوا ہے۔ موت ایک غیر مشروط سانحہ ہے۔ یہ نہیں کہ دنیا نعمتوں پر حریص اور ظالم لوگ ہی موت کا ذائقہ چکھیں گے اور نیک پاک لوگ اس سے بچے رہیں گے۔ نہیں ہر نفس کو موت کی تلخی چکھنی ہی پڑے گی۔

ਫਰੀਦਾ ਬਾਰਿ ਪਰਾਇਐ ਬੈਸਣਾ ਸਾਂਈ ਮੁਝੈ ਨ ਦੇਹਿ ॥
ਜੇ ਤੂੰ ਏਵੈ ਰਖਸੀ ਜੀਉ ਸਰੀਰਹੁ ਲੇਹੁ ॥੪੨॥

۴۲
فریدا بار پرائیئے بَیسنا سانئیں مجھُے نہ دیہِہ
جے تُوں ایوَے رکھسی جیو سریرہُ لیہہُ

بار = دروازہ، جیسے "گھر بار" میں بار دروازے کے معنی رکھتا ہے/ بَیسنا = بیٹھنا/ سائیں = خدا (خط نسخ میں جو کہ گرنتھ صاحب کی گورکھی کا گویا عکس ہے اس لفظ کی املا "سانئی" کی گئی ہے)/ اَیوے = اسی طرح/ رکھسی = آج کل کے استعمال کے مطابق "رکھسی" واحد غائب کے لیے آنا چاہیے لیکن یہاں "توں" کے لیے جو واحد حاضر ہے برتا گیا ہے۔ بہرحال قرینے سے "رکھسی" کا ترجمہ ہم "رکھوگے" ہی کریں گے/ جیو = جان/ لیہہ = لے لو/ اصل گورکھی شلوک میں قافیے کا استعمال محلِ نظر ہے "دیہے" اور "لیہہُ" ہم قافیہ نہیں ہوسکتے، اگرچہ

ان کے جدید متبادل دیہ اور لیہہ ہم قافیہ ہیں اور یہی شکل ہم نے نستعلیق املا میں استعمال کی ہے تاکہ قافیہ قائم رہے -

اے فرید پرائے در پر بیٹھنا (یعنی خدا کے سوا کسی اور سے کچھ مانگنا) خدا مجھے نہ دے - لیکن اے خدا اگر تو یوں ہی رکھے (یعنی دوسرے کا محتاج رکھنا چاہے) تو (بہتر ہے کہ) میری جان بدن سے لے لے (نکال لے) -

یہاں خودداری کی تعلیم دی گئی ہے - دوسروں سے کچھ مانگنے کو موت سے بدتر کہا گیا ہے - پہلی نظر شاید کسی کو خیال آئے کہ خدا جو کچھ کرنا چاہتا ہے (اویں رکھسی) یہ فرید اس کا بندہ اس کے خلاف چاہتا ہے - لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہوگا - ایک اس لیے ہماری شاعری میں اس طرح کا اختلاف ایک روایت ہے - بُلّھے شاہ اور اقبال سے بہت مثالیں اس کی دی جاسکتی ہیں - دوسرے یہ کہ سائیں لازماً خدا کے لیے نہیں لایا جاتا - آپ چاہیں اسے اپنا مرشد یا اس سے کم درجے پر اپنا محبوب سمجھ سکتے ہیں اور ان سے تو شکایت کی ہر وقت گنجائش ہے -

ਕੰਧਿ ਕੁਹਾੜਾ ਸਿਰਿ ਘੜਾ ਵਣਿ ਕੇਸਰੁ ਲੋਹਾਰੁ ॥
ਫਰੀਦਾ ਹਉ ਲੋੜੀ ਸਹੁ ਆਪਣਾ ਤੂ ਲੋੜਹਿ ਅੰਗਿਆਰੁ॥੪੩॥

۴۳
کنّدھِ کُہاڑا سِر گھڑا ونِ کےَ سرُ لُہارُ
فریدا ھو لوڑی سہُ آپنا توُ لوڑہِ انگیارُ

وَن = بن جنگل / ون کےَ سرُ = بن کے سر پر یعنی بن میں - گرنتھ صاحب کی تحریر میں الفاظ الگ الگ نہیں ہوتے بلکہ ایک دوسرے سے جُڑے رہتے ہیں - اس لیے "کے سرُ" کو ایک شارح نے "قیصر" پڑھا ہے اور ون قیصر کا مفہوم جنگل کا بادشاہ لکھا ہے - ہو سکتا ہے کہ یہ ٹھیک ہو - لیکن لُہار کا "ون کے سر" پر آنا بھی اسے بن کا کار مختار ہی بنا دیتا ہے - لہٰذا دونوں صورتوں میں مفہوم زیادہ مختلف نہیں رہتا / ہَوں = میں / توُں لوڑیں = تم ڈھونڈتے ہو / انگیار = انگار - انگار جلتے ہوئے کوئلے کو کہتے ہیں لیکن یہاں مُراد چوبِ سوختنی یعنی بالن کی لکڑی ہے - جو آگے چل کر کوئلے اور انگاروں کی شکل اختیار کر لیتی ہے -

کاندھے پر کُلہاڑا - سر پر پانی کا گھڑا رکھے لہار بن کے سر پر (بادشاہ بنا) آیا ہے - اے لہار میں (فریدؒ) تو یہاں بن میں اپنا رب ڈھونڈتا ہوں اور تو ڈھونڈتا ہے بالن کی لکڑی -

اس شلوک میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ایک ہی ماحول میں مختلف انسان مختلف چیزیں ڈھونڈتے اور پاتے ہیں - اقبال کہتا ہے :

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

جنگل - تارک الدنیا لوگوں کے گیان دھیان کے لیے اور ان کے لیے جنھیں قدرتی مناظر کی عظمت اور خوبصورتی خدا کی یاد دلاتی ہے نہایت مناسب جگہ ہے - افسوس ہے کہ آجکل ہمارے ایشیائی ملکوں میں یہی جنگل نہایت بے دردی سے انگیاروں کے لیے کلہاڑوں کے نیچے لائے جا رہے ہیں - جنگل جنت کے باغ ہیں اور انگیار دوزخ کے لیے جانی پہچانی علامت ہیں - بابا جی کو بھی اور ہمیں بھی افسوس ہے کہ ہم اس جنت کو دوزخ میں بدل رہے ہیں -

ਫਰੀਦਾ ਇਕਨਾ ਆਟਾ ਅਗਲਾ ਇਕਨਾ ਨਾਹੀ ਲੋਣੁ ॥
ਅਗੈ ਗਏ ਸਿੰਞਾਪਸਨਿ ਚੋਟਾਂ ਖਾਸੀ ਕਉਣੁ ॥੪੪॥

۴۴
فریدا اِکنا آٹا اَگلا اِکنا ناھی لونُ
اگےَ گئے سِنجّا پسنِہ چوٹاں کھاسی کونُ

اِکناں = ایک کو / اگلا = بہت، وافر / لون = لُون، نمک - مگر یہ دیکھتے ہوئے کہ جو لفظ اگلے مصرعے کے آخر پر اس کا قافیہ بنا ہے وہ "کون" ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ لُون نہ ہو بلکہ لَون ہو جس کے معنی لاوَن یا سالن ہوتے ہیں - لاوَن نہ ہونے کا ذکر ایک پہلے شلوک میں آ چکا ہے : ع روٹی میری کاٹھ دی لاون میری بُھکھ - / سنجھاپسن = پہچانیں گے، آخرت میں

اعمال کی قدر وقیمت تولنے والے (غالباً فرشتے) پہچانیں گے / چوٹاں کھاسی = مار کھائے گا، عذاب سہے گا۔

اے فریدؒ، ایک وہ ہیں جنھیں بہت زیادہ آٹا ملا ہے اور ایک وہ ہیں کہ اُن کے پاس نمک تک نہیں۔ آگے جاکر سمجھایا جائے گا کہ مستحق عذاب کون ہے۔

دنیا کے لوگوں کی حالت کا معائنہ کرتے ہوئے فریدؒ فرماتے ہیں کہ کچھ وہ ہیں جن کے پاس ضرورت سے زیادہ مال و اسباب ہے اور کچھ بالکل تہی دست ہیں باوجود اس کے کہ زاید از ضرورت مال سے اچھے کام بھی کیے جا سکتے ہیں اور تنگدستی عزتِ نفس کو زایل بھی کرسکتی ہے وہ ان دو کی اچھائی برائی کا فیصلہ خود نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ یہ فیصلہ خدا ہی کرے گا تاہم بابا کی زندگی اور کلام پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے دیکھا جائے گا کہ ان کی طبیعت میں فقر اور فقیری کو بہتر سمجھنے کا نمایاں میلان ہے۔ ؏ جنھاں کھادی چوپڑی گھنے سہن گے دکھ (۲۸)

ਪਾਸਿ ਦਮਾਮੇ ਛਤੁ ਸਿਰਿ ਭੇਰੀ ਸਡੋ ਰਡ ॥
ਜਾਇ ਸੁਤੇ ਜੀਰਾਣ ਮਹਿ ਥੀਏ ਅਤੀਮਾ ਗਡ ॥੪੫॥

۴۵

پاسِ دمامے چھتُ سِرِ بھیری سڈو رڈ
جاءِ سُتے جِیراں مہہ تھیئے اتیما گڈ

دماے = دمدمے، نقارے، دھونسے / چھت = چھتر۔ پُرانے بادشاہی عہد میں ہر شخص نقارہ، علم اور چھتر نہیں رکھ سکتا تھا۔ انہیں رکھنے کی اجازت صرف خاص منصب کے اُمرا ہی کو بادشاہ کی طرف سے دی جاتی تھی / بھیری = تُوتی، شہنائی، نفیری / سڈ = سد، بول / رڈ = بھاٹ، لہذا سڈو رڈ = وہ بول یا قصیدہ جو بھاٹ کسی تقریب میں پڑھتا ہے / جیراں = قبرستان، ویرانہ / ایتماں = یتماں، یتیموں لاوارثوں کی طرح / گڈ = گڈمڈ ہونا، رل جانا۔

جن کے پاس دمدمے بجتے تھے، سر پر چھتر ہوتے تھے، شہنائیاں بجتی تھیں اور قصیدہ گو بھاٹ تھے، وہ قبرستان میں جا سوئے اور لاوارثوں سے رل گئے۔

شلوک کے پہلے مصرعے میں شان و شوکت کے اُن وارثوں کا ذِکر ہوا ہے جو اپنی زندگی میں اعلیٰ ترین مناصب پر فائز تھے لیکن جب موت نے انہیں آن لیا تو وہ یتیموں اور لاوارثوں کی طرح ہی بے نشان قبروں میں جا سوئے۔ بابا فرید کی شاعری میں موت کا ذکر بار بار ہوا ہے اور یہ اس کی ایک مثال ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਕੋਠੇ ਮੰਡਪ ਮਾੜੀਆ ਉਸਾਰੇਦੇ ਭੀ ਗਏ ॥
ਕੂੜਾ ਸਉਦਾ ਕਰਿ ਗਏ ਗੋਰੀ ਆਇ ਪਏ ॥੪੬॥

۴۶

فریدا کوٹھے منڈپ ماڑیا اُساریدے بھی گئے
کُوڑا سَودا کرِ گئے گوری آءِ پیئے

منڈپ = منڈوا۔ بڑا سائبان یا ہال جو کسی تقریب میں کھڑا کیا جاتے / ماڑیاں = چُبارے، محل / اُساریندے = اُسارن مصدر سے، کھڑا کرنا، کھڑے کرتے ہوئے / بھی کا لفظ پچھلے شلوک سے ایک رابطہ پیدا کرتا ہے جس میں نقارے اور نشان والوں کے عبرتناک انجام کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ / کُوڑا = جھوٹا / گوریں = گوریں۔

کوٹھے، منڈوے اور محل تعمیر کرنے والے بھی چلے گئے۔ یہ ایک جھوٹا بیوپار تھا جو وہ کر گئے اور اب قبروں میں آ پڑے ہیں۔

اس شلوک کے معنی صاف ہیں، کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔

ਫਰੀਦਾ ਖਿੰਥੜਿ ਮੇਖਾ ਅਗਲੀਆ ਜਿੰਦੁ ਨ ਕਾਈ ਮੇਖ ॥
ਵਾਰੀ ਆਪੋ ਆਪਣੀ ਚਲੇ ਮਸਾਇਕ ਸੇਖ ॥੪੭॥

۴۷
فریدا کِھنتھڑِ میکھا اَگلیا جِنّدُ نَ کائی میکھ
واری آپو آپنی چلے مسائک سیکھ

کِھنتھڑ = گودڑی، مراد جسم ہے / میکھاں = ٹانکے / اگلیاں = بہت / جنّد = جان، رُوح / چلے = چلے موت کی طرف یعنی مرگئے / مسائک شیخ = مشائخ، شیخ کی جمع ہے، مُراد ہے ہر قسم کے اور سارے عابد، زاہد، گدی نشین پیر اور مرشد۔

گودڑی (جسم) کے بہت ٹانکے ہیں لیکن رُوح میں کوئی ٹانکا نہیں۔ اپنی اپنی باری پر سبھی شیخ اور مشائخ اس دنیا سے چلے گئے۔

کِھنتھڑ یا گودڑی سے جو متعدد ٹکڑیوں سے بنی ہوتی ہے اکثر شارحین نے انسانی بدن مُراد لیا ہے۔ اگر یہ ہے تو فریدؒ کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ جسم ایک مرکب شے ہے جس کے مقابلے میں رُوح مفرد چیز ہے۔ فلسفیوں کے نزدیک مرکب اشیا آخر کار اپنے اجزا میں بٹ بٹ کر اپنی ماہیت بدل لیتی ہیں اور ایک طرح فنا ہو جاتی ہیں، لیکن رُوح چونکہ مفرد شے ہے اس لیے فنا نہیں ہوتی۔ یہ فلسفہ جو پہلے مصرعے کا حاصل ہے، ٹھیک ہی ہوگا لیکن اس کا تعلق اگلے مصرعے سے، جس میں یہ کہا گیا ہے کہ شیخ مشائخ بھی فنا ہو جائیں گے، واضح نہیں۔ شیخ مشائخ میں بدن اور رُوح کا کوئی انوکھا تعلق نہیں ہوتا۔ بدن اور رُوح رکھنے میں تو سب انسان مشترک ہیں۔ یہ صفت کچھ شیخ مشائخ کے لیے خاص نہیں۔ تاہم دونوں مصرعے اپنی اپنی جگہ پر معانی، فارم اور صوتی اعتبار سے خوبصورت ہیں۔

ਫਰੀਦਾ ਦੁਹੁ ਦੀਵੀ ਬਲੰਦਿਆ ਮਲਕੁ ਬਹਿਠਾ ਆਇ ॥
ਗੜੁ ਲੀਤਾ ਘਟੁ ਲੁਟਿਆ ਦੀਵੜੇ ਗਇਆ ਬੁਝਾਇ ॥੪੮॥

۴۸
فریدا دُہُ دِیوی بلنّدِیا ملکُ بہیٹھا آءِ
گڑُلیتا گھٹ لُٹیا دِیوڑے گیا بُجھاءِ

دِویں = دیئے، دیّوں کے، آنکھوں کے / بلندیاں = بلتے ہوئے، جلتے ہوئے، روشن ہوتے ہوئے / مَلک = ملک الموت / بہیٹھا = بیٹھا / گڑ = گڑھ، قلعہ، بدن / گھٹ = دل، سنسکرت میں گھٹ "اندرون" کے معنوں میں بھی آتا ہے / دیوڑے = دیئے۔

دونوں دیئے ابھی جل رہے تھے (یعنی دونوں آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی تھیں) کہ ملک الموت (بہ اندازِ فاتحانہ) آ پہنچا (اور اُس نے جسم کا) قلعہ لے لیا، اندروں لُوٹ لیا (یعنی شعور یا جان قبض کر لی) اور جلتے ہوئے دیئے بُجھا گیا۔

چوروں کا طریقہ ہے کہ جہاں واردات کرنی ہو وہاں کی روشنیاں پہلے بُجھا دیتے ہیں۔ لیکن ملک الموت جب انسان کے جسم اور رُوح کو لُوٹتا ہے تو بڑی دیدہ دلیری سے کام لیتا ہے۔ وہ انسان کی آنکھوں کے چراغوں کو روشن ہی رہنے دیتا ہے اور ان کی روشنی ہی میں اس کے قلعۂ جسم کی فصیلیں کو توڑتا ہوا اُس کے اندرون سے اُس کی جان کو قبض کر لیتا ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ دیئے بُجھاتا ہے تو جاتے ہوئے بُجھاتا ہے یعنی آنکھوں کا نُور ختم کر جاتا ہے۔ ازمنۂ قدیم کے نظریئے کے مطابق آنکھ کے دیکھنے کے عمل میں آنکھ سے روشنی کی شعاعیں نکلتی تھیں جو ارد گرد کی اشیا پر پڑتی تھیں اور وہ نظر آنے لگتی تھیں۔ اگرچہ قرونِ وسطیٰ کے بعض عرب سائنسدانوں نے اس نظریئے کی تردید کی اور ثابت کیا کہ روشنی کی کوئی شعاع آنکھ سے نہیں نکلتی لیکن آنکھوں کے چراغ کی طرح روشن ہونے کا خیال، خصوصاً شعر میں، پھر بھی مروّج رہا ہے۔ چنانچہ بابا فریدؒ کے اس شلوک میں بھی دو آنکھوں کے لیے دو دیّوں کا استعارہ برتا گیا ہے۔ اس میں واردات کی تفصیلات، یعنی ملک الموت کا روشنی میں حملہ کرنا، گڑھ کا توڑنا، اندرون میں جا کر جان کا نکالنا اور آخر میں روشنی کا بُجھا جانا، اس درجہ ایک دوسرے سے پیوستہ اور ہم ربط ہیں کہ وہ اسے شاعری کا ایک بے مثل نمونہ بنا دیتی ہیں۔

ਫਰੀਦਾ ਵੇਖੁ ਕਪਾਹੈ ਜਿ ਥੀਆ ਜਿ ਸਿਰਿ ਥੀਆ ਤਿਲਾਹ ॥
ਕਮਾਦੈ ਅਰੁ ਕਾਗਦੈ ਕੁੰਨੇ ਕੋਇਲਿਆਹ ॥
ਮੰਦੇ ਅਮਲ ਕਰੇਦਿਆ ਏਹ ਸਜਾਇ ਤਿਨਾਹ ॥੪੯॥

۴۹
فریدا ویکھ کپاہَے جِ تِھیا جِ سِرِ تِھیا تلاہ
کمادے ارُ کاگدے کُنّے کوئِلیاہ
مندے عمل کریدیا ایہہ سجاءِ تِناہ

کپاہے = کپاس کے ساتھ / سِر = سر پر / تلاہ = تل / کمادے = گنے پر / کاگدے = کاغذ پر / کُنّے = ہانڈے پر / کوئلیاہ = کوئلوں کی / مندے = بُرے / کریدیا = کرنے والے / سجا = سزا۔

زرا دیکھ جو کپاس کے ساتھ ہُوا اور جو تلوں کے سر پر سے گزرا۔ (اسی طرح دیکھ) جو گنّے، کاغذ، ہنڈیا اور کوئلوں پر بیتیا۔ اے بُرے عمل کرنے والے! یہ اُن کی سزا تھی۔

شلوک ۳۹ میں گھڑیال کے بے قصور پیٹے جانے پر فریدؒ نے پوچھا تھا کہ جب بے قصوروں کا یہ حال ہے تو قصورواروں کا بھلا کیا حال ہوگا۔ موجودہ شلوک میں کچھ اور مثالیں پٹنے والوں کی، مثلاً کپاس، تل، کماد، کاغذ، ہانڈے اور کوئلوں کی دی گئی ہیں اور عقل سمجھ اور شعور رکھتے ہوئے بھی بُرے عمل کرنے والوں کو ڈرایا گیا ہے کہ جس طرح انہیں بیلنے، کولہو میں پسنے، "پیڑنے"، کوٹنے، آوے میں پکنے اور جلنے کی سزائیں دی جاتی ہیں اسی طرح تمہیں بھی سزائیں دی جائیں گی۔ البتہ ایک فرق شلوک ۳۹ کے گھڑیال کے پٹنے اور ان موجودہ سزاؤں میں یہ نظر پڑتا ہے کہ یہاں ہر "سزا" کے عمل کے نتیجے پر کوئی بہتر شے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً خام کپاس سے روئی، تل سے تیل، کماد سے رس، چیتھڑوں سے کاغذ اور مٹی کی پکائی سے ہانڈی ظہور میں آتی ہیں۔ اس لیے شاید یہ کہنا بہت غلط نہ ہوگا کہ سزا کی تکلیف قلبِ ماہیت کرتی ہے اور اعلیٰ مقام کی طرف لے جاتی ہے۔ چنانچہ بعض فلسفیوں کے خیال میں آخرت کی سزا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ جو آگ کا عمل ان کے لیے برتا جاتا ہے وہ اشارہ ہے ایسے عمل کی طرف جو (اگرچہ کربناک ہے پر) وہ انسان کی قلبِ ماہیت کرتا ہے اور اسے نجات اور بہتری کی طرف لے جاتا ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਕੰਨਿ ਮੁਸਲਾ, ਸੂਫੁ ਗਲਿ, ਦਿਲਿ ਕਾਤੀ, ਗੁੜੁ ਵਾਤਿ ॥
ਬਾਹਰਿ ਦਿਸੈ ਚਾਨਣਾ ਦਿਲਿ ਅੰਧਿਆਰੀ ਰਾਤਿ ॥੫੦॥

۵۰
فریدا کِن مُسلا سُوفُ گلِ دِلِ کاتی گڑُ واتِ
باہر دِسے چانݨا دِلِ انّدھیاری راتِ

کنھ = کاندھے پر / صُوف = اُونی کپڑے کی کفنی / کاتی = چھُری / گڑُ وات = میٹھی بات / دسّے = نظر آئے / چانݨا = روشنی، نُور۔

کندھے پر مُصلّےٰ ڈالے، گلے میں اُونی کفنی پہنے اور میٹھی باتیں کرتے ہوئے لیکن دِل چھُری کی طرح (خوں ریز) (یہ ایسے لوگ ہیں کہ) ظاہر میں نُور دنُور دکھائی دیتے ہیں لیکن اُن کے باطن اندھیری رات کی طرح ہیں (یعنی اُن کے دِل سیاہ ہیں)۔

جب سے تارک الدنیا لوگوں کو محترم اور مقدّس سمجھتے ہوئے قدرتی طور پر اُن کا ادب کیا جانے لگا ہے ایک گروہ اُن کے نقّالوں کا بھی پیدا ہو گیا ہے۔ یہ لوگ اپنے ترکِ دنیا کا اشتہار کفنی پہن کر، مُصلّے اور لمبی لمبی تسبیحیں اٹھا کر دیتے رہتے ہیں اور خلقِ خُدا اُن کے ظاہر سے دھوکا کھاتی رہتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ لوگ سخت دِل اور خود غرض ہوتے ہیں اور انہیں دوسرے لوگوں سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ اس شلوک میں فرید لوگوں کو ایسے نقّالوں سے خبردار کر رہے ہیں۔

ਫਰੀਦਾ ਰਤੀ ਰਤੁ ਨ ਨਿਕਲੈ ਜੇ ਤਨੁ ਚੀਰੈ ਕੋਇ ॥
ਜੋ ਤਨ ਰਤੇ ਰਬ ਸਿਉ ਤਿਨ ਤਨਿ ਰਤੁ ਨ ਹੋਇ ॥੫੧॥

۵۱

فریدا رتی رتُ نَ نِکلَے جِ تنُ چیرَے کوءِ
جُ تنُ رتے رب سیو تِنْ تَنِ رتُ نَ ھوءِ

رتی = وزن کا ایک بہت چھوٹا پیمانہ، مراد بہت تھوڑا / رت = لہو / رتے رب سیوں = رنگے گئے رب کے رنگ سے / تن تَن = اُس کے بدن میں۔

رتی بھر خون بھی نہیں نکلے گا اگر (اِن عُشاق کا) بدن کوئی چیرے۔ جو بدن (مراد انسان) رب کے رنگ سے رنگا گیا (یعنی خدا کی اطاعت یا محبت میں اپنا آپ کھوگیا) اس بدن میں خون نہیں ہوتا۔

اگر کوئی سمجھے کہ رَت سے مراد وہ سُرخ رنگ سیال ہے جو واقعی رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے تو پھر فرید کا یہ دعوٰی کہ بدن چیرنے پر وہ باہر نہیں آئے گا صحیح نہیں ہوگا۔ لیکن یہاں پر خون بھی دِل کی طرح ایک علامت اور سمبل ہے جس سے مراد دنیاوی لالچ اور خوف ہے۔ کنایہ مقصود ہے کہ جو انسان خدا کی محبت میں کامل ہے اُس سے دنیا کا لالچ اور خوف بھی کاملاً چھٹ جاتا ہے۔ اگرچہ اسلامی اعتقاد کے مطابق خدا مادے کے ظاہری خواص مثلاً رنگ اور زمان و مکان وغیرہ سے منزّہ اور پاک ہے تاہم قرآن شریف میں "صبغۃ اللّٰہ" کے لفظ آئے ہیں جن کے معنی ہیں ربّی رنگ۔ ان الفاظ سے کسی کو غلط فہمی نہیں لگنی چاہیے کیونکہ یہ بطور استعارہ آتے ہیں؛ حقیقۃً تو خدا کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔

ਇਹੁ ਤਨੁ ਸਭੋ ਰਤੁ ਹੈ ਰਤੁ ਬਿਨੁ ਤੰਨੁ ਨ ਹੋਇ ॥
ਜੋ ਸਹ ਰਤੇ ਆਪਣੇ ਤਿਤੁ ਤਨਿ ਲੋਭੁ ਰਤੁ ਨ ਹੋਇ ॥
ਭੈ ਪਇਐ ਤਨੁ ਖੀਣੁ ਹੋਇ ਲੋਭੁ ਰਤੁ ਵਿਚਹੁ ਜਾਇ ॥
ਜਿਉ ਬੈਸੰਤਰਿ ਧਾਤੁ ਸੁਧੁ ਹੋਇ,
ਤਿਉ ਹਰਿ ਕਾ ਭਉ ਦੁਰਮਤਿ ਮੈਲੁ ਗਵਾਇ ॥
ਨਾਨਕ ਤੇ ਜਨ ਸੋਹਣੇ ਜਿ ਰਤੇ ਹਰਿ ਰੰਗੁ ਲਾਇ ॥੫੨॥

۵۲

ایہہ تنُ سبھُ رت ھَے رتُ بِنُ تنُ نَ ھوءِ
جوسہہُ رتے آپنڑے تِتُ تنِ لوبھُ رتُ نَ ھوءِ
بھَے پیئے تنُ کھِینڑُ ھوءِ لوبھُ رتُ وِچہہ جاءِ
جیو بَیسنترِ دھاتُ سُدھُ ھوءِ
تِیو ھرِ کا بھَو دُرمتِ مَیلُ گواءِ
نانک تے جَن سوھنڑے جو رتے ھرِ رنگُ لاءِ

(گُرو امرداس)

(یہ شلوک فریدؒ کا نہیں بلکہ گرو امرداس کا ہے اور خلافِ معمول دو کی بجائے چھ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ فریدؒ نے جو پچھلے شلوک میں کہا تھا کہ ربّی رنگ میں رنگے ہوئے عُشاق کے بدن میں لہو نہیں ہوتا، گرو امرداس نے اسی مضمون کو ذرا اور آگے بڑھایا ہے اور کہا ہے کہ ایسوں کے بدن میں لہو تو ہوتا ہے لیکن اس میں دنیا کا لالچ نہیں ہوتا۔ دونوں باتوں میں تناقض نہیں ہے کیونکہ فرید نے لہو بطور استعارہ برتا ہے۔ تخلص نانک درج ہُوا ہے کیونکہ گرو صاحبان میں ایک روایت یہ چل نکلی تھی کہ وہ اپنے اشعار کو بھی اپنے گرُو یعنی نانک کے نام سے

منسوب کیا کرتے تھے۔ رتے آپنے = اپنے رنگ میں رنگے / لوبھ رت = لالچ میں بسا لہو / بھے = بھو، ڈر، خوفِ خدا / کھین = دُبلا / بَیسنتر = آگ / سُدھ = شُدھ، صاف خالص / ہر = خدا / دُرمت = بُری مت، بُرا طریقہ / جَن = جنا، انسان / مصرع نمبر ۲ باعتبار وزن محلِ نظر ہے: لوبھ یا رت میں سے ایک لفظ نکالنا ضروری نظر آتا ہے۔ اس سے معنوں میں زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔

یہ تن تمام لہو ہے اور کوئی تن بھی لہو کے بغیر نہیں ہوتا۔ جس تن کو شوہ اپنے رنگ میں رنگ دے اس تن میں لالچ کا لہو نہیں رہتا۔ (خدا کا) خوف لگ جائے تو جسم دُبلا ہو جاتا ہے اور خون میں سے لالچ اسی طرح نکل جاتا ہے جس طرح آگ سے دھات شُدھ (خالص) ہو جاتی ہے (اور اس میں سے کھوٹ نکل جاتا ہے) خدا کا خوف بُری مت یعنی گناہگاری کی میل یا آلودگی کو کاٹ دیتا ہے۔ اے نانک وہی انسان خوبصورت ہیں جو رب کے رنگ میں رنگے ہیں۔

اس شلوک میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ جو تربیت یا ڈسپلن ایک منفی صفت یعنی لالچ کے نہ رکھنے سے شروع ہوا تھا وہ ایک مُثبت صفت پر عروج پا کر ختم ہوتا ہے' جو عبارت ہے خوبصورتی اور جمال سے۔ یہ ایک سچائی ہے کہ اخلاقِ عالیہ آخر کار جمال پیدا کرتے ہیں اور جمال پر مُنتج ہوتے ہیں۔

ਫਰੀਦਾ ਸੋਈ ਸਰਵਰੁ ਢੂਢਿ ਲਹੁ ਜਿਥਹੁ ਲਭੀ ਵਥੁ ॥
ਛਪੜਿ ਢੂਢੈ ਕਿਆ ਹੋਵੈ ਚਿਕੜਿ ਡੁਬੈ ਹਥੁ ॥੫੩॥

۵۳

فریدا سوئی سرورُ ڈھوڈھِ لہُ جِتھہُ لبھی وتھُ
چھپڑِ ڈھوڈھے کیا ہووَے چکڑِ ڈُبےَ ہتھُ

سوئی = وہی / سرور = جھیل / لہ = لو / لبھی = تجھے ملے / وتھ = دست، چیز / چھپڑ = ناصاف پانی کا تالاب۔

وہی (صاف اور گہرے پانی کی) جھیل تلاش کرو جس میں سے تمہیں کوئی شے ملے (یعنی موتی ملے) چھپڑ میں ڈھونڈنے سے کیا (فائدہ) ہوگا؟ کیچڑ ہی میں ہاتھ ڈوبیں گے اور بس۔

گہرے صاف پانی کی جھیل اور چھپڑ کا اشارہ کسی طرف بھی سمجھا جا سکتا ہے، لیکن اغلب یہ ہے کہ یہاں اشارہ علی الترتیب گہری طبیعت کے اور چھچھورے انسان کی طرف ہے۔ گہری طبع کے مُرشد یا رفیقِ طریقت سے تو کچھ حاصل ہونے کی توقع رکھی جا سکتی ہے لیکن کسی چھچھورے، نمائشی اور نقلی پیر یا رفیق سے اُلٹی تہمتیں ہی لگیں گی اور لوگوں کا اڑایا ہوا کیچڑ ہی منہ پر پڑے گا۔ اس لیے مرشد یا رفیقِ طریق کے انتخاب میں بڑی احتیاط اور بصیرت سے کام لینا ضروری ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਨੰਢੀ ਕੰਤੁ ਨ ਰਾਵਿਓ ਵਡੀ ਥੀ ਮੁਈਆਸੁ ॥
ਧਨ ਕੂਕੇੰਦੀ ਗੋਰ ਮੇਂ ਤੈ ਸਹ ਨ ਮਿਲੀਆਸੁ ॥੫੪॥

۵۴

فریدا ننڈھی کنت نَ راویو وڈی تھی مئی آس
دھن کوکیندی گور میں تے سہہ نَ ملی آس

ننڈھی = نڈھی، کم عمر عورت / کنت = خاوند، خدا / راویو = رجھایا / وڈی تھی = بڑی ہوئی پر / موئیس = مرگئی / دَھن = عورت / کوکیندی = چلاتی / تے = تجھ کو، تجھے / سہہ = اے شوہ۔

نوجوانی کی عمر میں تو خاوند (خدا) کو (عبادتوں اور نیک کاموں سے) نہ رجھایا اور بڑی (بڈھی) ہونے پر موت آگئی (جس نے اب عبادات وغیرہ کو ناممکن بنا دیا)۔ ایسی عورت قبر میں فریادیں کرتی ہے کہ اے شوہ میں تجھے وقت پر نہ ملی (یاد کرنے سے قاصر رہی)

بابا فریدؒ نے یہ مضمون کہ بڑھاپے میں عبادات اور نیک کام نہیں ہو سکتے کئی جگہ دہرایا ہے۔ اُن کی تعلیم یہ ہے کہ یہ کام جوانی میں کرنے کے ہیں

ਫਰੀਦਾ ਸਿਰੁ ਪਲਿਆ ਦਾੜੀ ਪਲੀ ਮੁਛਾਂ ਭੀ ਪਲੀਆਂ ॥
ਰੇ ਮਨ ਗਹਿਲੇ ਬਾਵਲੇ ਮਾਣਹਿ ਕਿਆ ਰਲੀਆਂ ॥੫੫॥

۵۵

فریدا سِرُ پلیا داڑی پلی مچھاں بھی پلیاں
رے من گہلے باوے ماݨہہ کیا رلیاں

سر = یہاں مراد بالوں سے ہے، کیونکہ محاورے میں بال پکتے ہیں نہ کہ سر/ پلیا = پکا، پک گیا/ گہلے = غافل/ رلیاں = خوشیاں۔ رنگ رلیاں کا محاورہ عام ہے/ ماݨہہ = مانا (خوشیاں مانا)

سر (کے بال) پک گئے، داڑھی (کے بال) پک گئے، مونچھوں (کے بال) بھی پک گئے، ارے (میرے) غافل اور باوے من! کیا مناتا ہے ہو خوشیاں!

فریدؒ نے یہ مضمون کئی جگہ دُہرایا ہے کہ اگر جوانی بے خیالی سے رنگ رلیوں میں گزری ہے تو کم از کم بڑھاپے میں توجہ الی اللہ ہونی چاہیے۔ خواجہ حافظ نے بھی اپنے طریق میں یہی مضمون یُوں بیان کیا ہے۔ چُوں پیر شُدی حافظ ازمیکدہ بیروں آ رِندی و خراباتی در عہدِ شباب اولٰے

ਫਰੀਦਾ ਕੋਠੇ ਧੁਕਣੁ ਕੇਤੜਾ, ਪਿਰ ਨੀਦੜੀ ਨਿਵਾਰਿ ॥
ਜੋ ਦਿਹ ਲਧੇ ਗਾਣਵੇ ਗਏ ਵਿਲਾੜਿ ਵਿਲਾੜਿ ॥੫੬॥

۵۶

فریدا کوٹھے دُھکنُ کیتڑا پرِ نیدڑی نِوارِ
جودِہ لدھے گانوے گئے وِلاڑِ وِلاڑِ

کوٹھے = کوٹھے پر، کوٹھے میں/ دُھکن = دوڑنا، چھلانگیں مارنا (ایک شارح نے اسے "ڈُھکن" لکھا ہے جس کے معنی پہنچنا یا ٹھکانا کرنا ہے/ کیتڑا = کتنا، کب تک/ نیندڑی = نیند کی تصغیر۔ خوابِ غفلت/ نِوار = دُور کر/ لدّھے = ملے ہیں/ گانویں = گنتی کے۔

محل ماڑیوں پر اچھل کُود (یعنی لہو و لعب کے جلسے) کب تک؟ اس نیند (خوابِ غفلت) کو دُور پھینک۔ جو گنتی کے دن تمہیں (عمر کے) ملے ہیں، وہ دن چھلانگیں مارتے ہوئے (یعنی تیزی سے) گزر رہے ہیں۔

پہلے مصرعے میں دُھکن اور دوسرے میں ولاڑ ایک دوسرے کے متقابل ہیں۔ ایک طرف تمہاری چھلانگیں ہیں اور دوسری طرف وقت کی۔ ظاہر ہے کہ وقت کے مقابلے میں تمہاری چھلانگیں کچھ نہیں؛ وقت زیادہ تیز رَو ہے۔ معنی صاف ہیں، یعنی عیش و عشرت کی زندگی کو ترک کرو اور عمر کے جو دن باقی رہ گئے ہیں انہیں یادِ خدا میں صرف کرو۔

ਫਰੀਦਾ ਕੋਠੇ ਮੰਡਪ ਮਾੜੀਆ ਏਤੁ ਨ ਲਾਏ ਚਿਤੁ ॥
ਮਿਟੀ ਪਈ ਅਤੋਲਵੀ ਕੋਇ ਨ ਹੋਸੀ ਮਿਤੁ ॥੫੭॥

۵۷

فریداکوٹھے منڈپ ماڑیا ایتُ نہ لائے چِتُ
مِٹی پیٔ اتولوی کوءِ نہ ہوسی مِتُ

منڈپ = یہ وہی لفظ ہے جو آجکل کی پنجابی میں منڈوہ بن گیا ہے۔ مُراد ایوان، ہال یا محل/ ایت = ان میں/ چیت = دل/ اتولویں = جو تولی نہ جا سکے، انتولی، بے اندازہ/ مِت = میت، دوست، ساتھی۔

Scanned with CamScanner

فرید اپنے مخاطب سے کہہ رہے ہیں کہ ان مکانوں اور حویلیوں میں دِل نہ لگاؤ ۔ جب تم مرو گے تو تمہیں قبر میں ڈال کر تمہارے اُوپر اَنتولی مٹی ڈال دی جائے گی ۔ وہاں یہ چیزیں تمہارے ساتھ نہ جائیں گی ۔

ਫਰੀਦਾ ਮੰਡਪ ਮਾਲੁ ਨ ਲਾਇ, ਮਰਗ ਸਤਾਣੀ ਚਿਤਿ ਧਰਿ ॥
ਸਾਈ ਜਾਇ ਸਮੑਾਲਿ, ਜਿਥੈ ਹੀ ਤਉ ਵੰਞਣਾ ॥੫੮॥

۵۸

فریدا منڈپ مالُ ن لاءِ مرگ ستانی چِتِ دھرِ
سا ای جاءِ سمھال جِتھَے ھی تَو وَنجنا

منڈپ = اَیوان ۔ بڑے بڑے مکان / نہ لاءِ = نہ لگا ۔ یہاں دل محذوف ہے ۔ یعنی دل نہ لگا / ستانی = تان والی ۔ طاقت ور / سائی = سوئی ، وہی / سمال = یاد رکھ / ونجناں = جانا ۔

اے فریدؔ مکانوں اور مال دولت میں دِل نہ لگا ، بلکہ موت جو زیادہ طاقتور ہے ، اسے دھیان میں رکھ ۔ وہ جگہ یاد رکھ جہاں تجھے آخر کار جانا ہے ۔

پہلے مصرعے کا وزن محلِ نظر ہے ۔ شاید "منڈپ مال نہ لاءِ فریدا" پڑھنے سے وزن درست ہو جاتا ہے ، لیکن دوسرے مصرعے کا وزن پھر بھی پہلے سے مختلف ہے ۔

ਫਰੀਦਾ ਜਿਨੑੀ ਕੰਮੀ ਨਾਹਿ ਗੁਣ, ਤੇ ਕੰਮੜੇ ਵਿਸਾਰਿ ॥
ਮਤੁ ਸਰਮਿੰਦਾ ਥੀਵਹੀ ਸਾਂਈ ਦੈ ਦਰਬਾਰਿ ॥੫੯॥

۵۹

فریدا جِنھی کمّی ناہِ گُن تے کمڑے وِسارِ
متُ شرمِندا تھیو ھی ، سائیں د دربار

گُن = اچھی صفتیں / تے = وہ / کمڑے = کم کی تصغیر ۔ چھوٹے چھوٹے حقیر کام ۔ بُرے کام / وسار = بسرا ، بُھول جا / مت = مبادا / تھیوہیں = ہوویں ۔

اے فرید جن کاموں میں اچھائی نہیں وہ کام بُھلا دے (یعنی وہ کام نہ کر) ، مبادا اُن کی وجہ سے تُو خدا کے دربار میں شرمندہ ہو ۔

ਫਰੀਦਾ ਸਾਹਿਬ ਦੀ ਕਰਿ ਚਾਕਰੀ ਦਿਲ ਦੀ ਲਾਹਿ ਭਰਾਂਦਿ ॥
ਦਰਵੇਸਾ ਨੋ ਲੋੜੀਐ ਰੁਖਾਂ ਦੀ ਜੀਰਾਂਦਿ ॥੬੦॥

۶۰

فریدا صاحِب دی کِرچا کری دِل دی لاہِ بھراندِ
درویشا نو لوڑِیئے رُکھاں دی جِیراندِ

صاحب = مالک ، خدا / چاکری = نوکری ، خدمتگاری ۔ چاکر = نوکر کا نوکر ، مراد ادنیٰ درجے کا نوکر ۔ پنجابی لفظ چاک غالباً اس سے تعلق رکھتا ہے / بھراند = شک ، شبہ ، وسوسہ / لوڑیئے = ضرورت ہے ، درکار ہے / رُکھ = درخت / جیراند = حوصلہ ، صبر ، بُردباری ۔

اپنے مالک کے کاموں کو (اُن کی بھلائی پر) پورا یقین رکھتے ہوئے کرتے رہو (اگر اس میں لوگوں کی مخالفت بھی سہنی پڑے تو سہہ لینا ، کیونکہ) درویش کہلانے والے کو درختوں جیسے حوصلے اور صبر کا مظہر ہونا چاہیے ۔

یہاں درخت کے "حوصلے" کی مثال اس لیے لائی گئی ہے کہ لوگ درخت کا پھل کھاتے ہیں ، اسے پتھر بھی مارتے ہیں اور اس کی ٹہنیاں بھی کاٹ لے جاتے ہیں ۔ لیکن اس

سب کچھ کے باوجود درخت پھل دینا بند نہیں کرتا۔ ایسے ہی درویش کو بھی اپنا فیض جاری رکھنا چاہیے اگرچہ وہ لوگ جو اس سے فیض پا رہے ہوں اسے ایذا ہی کیوں نہ دیں۔

ਫਰੀਦਾ ਕਾਲੇ ਮੈਡੇ ਕਪੜੇ ਕਾਲਾ ਮੈਡਾ ਵੇਸੁ ॥
ਗੁਨਹੀ ਭਰਿਆ ਮੈ ਫਿਰਾ ਲੋਕੁ ਕਹੈ ਦਰਵੇਸੁ ॥੬੧॥

٦١

فریدا کالے مَیڈے کپڑے کالا مَیڈا ویسُ
گنّھی بھریا مَے پھرا لوکُ کہَے درویسُ

مَیڈے = میرے / ویس = بھیس ؛ لباس، خصوصًا ایسا جو بہروپ ہو / گنّھی = گناہوں سے۔

میرے کپڑے اور میرا لباس کالے رنگ کا ہے جسے دیکھ کر لوگ مجھے درویش سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ میرا باطن گناہوں سے بھرا ہے۔

درویش کی ظاہری نشانیوں میں ایک اس کا لباس ہے جس میں گہرے صوفیانہ رنگ کی عبا زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ دوسری نشانی جس کا تعلق باطن سے ہے، گناہوں سے پاک زندگی ہے۔ لوگ اس کے ظاہری لباس کو دیکھ کر سمجھنے لگتے ہیں کہ اس کا اندرون بھی پاکیزہ ہوگا۔ لیکن یہ ضروری نہیں۔ یہ بھیس کر لینا یا وہ بھیس کر لینا آسان ہے لیکن باطن کی پاکیزگی حاصل کرنا آسان نہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ بابا فریدؒ کا باطن پاک نہیں تھا لیکن پاک لوگ اکثر اپنے آپ کو ملامت کرتے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ یوں بھی یہ شعر ہمارے عوام میں مشہور ہے اور لوگوں کو پاکیزگیِ باطن کی اہمیت کی طرف توجہ دلاتا رہتا ہے۔

ਤਤੀ ਤੋਇ ਨ ਪਲਵੈ, ਜੇ ਜਲਿ ਟੁਬੀ ਦੇਇ
ਫਰੀਦਾ ਜੋ ਡੋਹਾਗਣਿ ਰਬ ਦੀ, ਝੂਰੇਦੀ ਝੂਰੇਇ ॥੬੨॥

٦٢

تتی توءِ ن پلوے جے جل ٹُبی دیئے
فریدا جو ڈُوھاگنِ رب دی جھُوریدی جھُوریے

تتی = پانی نہ ملنے سے سڑ جلنے والی کھیتی / توءِ = پانی میں / پلوے = پلے، ہری ہو / جل = پانی / ٹُبھی = غوطہ / ڈوہاگن = بدنصیب، وہ عورت جس سے اس کا خاوند منہ موڑ لے / جھُوریندی جھُورے = جھُرنا غم میں گھُلنے کو کہتے ہیں، لہذا جھُوریندی جھُورے کے معنی ہوتے ہیں جھُرتی ہی رہے۔

جو کھیتی وقت پر پانی نہ ملنے سے جل سڑ گئی ہو، وہ اب پانی دینے سے ہری نہیں ہوگی خواہ اسے بے حساب پانی میں ڈبو ہی کیوں نہ دیا جائے۔ اسی طرح جس رُوح نے رب سے منہ موڑ لیا اب اس کے نصیب میں افسوس سے ہاتھ ملنا ہی رہ گیا ہے ؛ وہ دوبارہ رب کو نہیں پائے گی۔

یہ شعر بابا فرید کی مطلق ناامیدی کا مظہر ہے۔ اور بھی بہت جگہ یہ کیفیت دکھائی دیتی ہے۔

ਜਾਂ ਕੁਆਰੀ ਤਾਂ ਚਾਉ, ਵੀਵਾਹੀ ਤਾਂ ਮਾਮਲੇ ॥
ਫਰੀਦਾ ਏਹੋ ਪਛੋਤਾਉ, ਵਤਿ ਕੁਆਰੀ ਨ ਥੀਐ ॥੬੩॥

٦٣

جاں کواری تاں چاؤ وِوَاہی تاں مامِلے
فریدا ایہو پچھوتاؤ وتِ کُوآری ن تھیئے

چاؤ = شوق / رِدواہی = بیاہی / ملٹے = معلطے۔ شادی کے بعد سُسرال (دنیا) میں تکلیف دہ نئے تعلقات۔

جب میں کنواری تھی تو چاؤ تھا کہ میرا بیاہ ہوجائے۔ لیکن جب بیاہ ہوا تو سُسرال میں نئے تعلقات کے پھیلے ہوئے جال میں پھنس گئی۔ اب یہی پچھتاوا لگ رہا ہے کہ میں پھر دوبارہ کنوارپنے کی حالت میں نہیں آسکتی۔

یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ بابا فرید کی کنوارپنے اور بیاہی حالت سے کیا مُراد ہے۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ یہاں انسانی رُوح کی بات ہورہی ہے تو کنوارپنے کی حالت وہ ہوگی جو رُوح کی ازل میں تھی، یعنی جب وہ عرش پر رب کے ساتھ تھی اور ابھی انسانی بُت یعنی جسم میں داخل نہیں ہوئی تھی اور بیاہی حالت وہ ہوگی جب وہ جسم میں داخل ہوئی۔ لیکن ہماری معروف روایت فرید کے قول کے خلاف یہ ہے کہ رُوح کو جسم کی اندھیری کوٹھری میں داخل ہونے کا کوئی چاؤ نہیں تھا بلکہ اسے در غلا کر بطائف الحیل اس میں داخل کیا گیا۔ اور روایت کے مطابق فرید کی یہ بات بھی ٹھیک نہیں کہ رُوح دوبارہ رب سے واصل نہیں ہوگی۔ روایت یہی ہے کہ رُوح آخر کار اپنے مرکز اور اصل کی طرف لوٹ جائے گی اور واصل بحق ہوگی۔

شاید یہ بھی کہا جائے کہ بات عرش اور رب کی نہیں بلکہ ماں کے پیٹ کی ہے۔ پہلی صورت وہ ہے جس میں انسان ماں کے پیٹ میں تھا، جہاں اسے مکمل سکون حاصل تھا اور وہ کسی کشمکش میں مبتلا نہیں تھا۔ دوسری صورت وہ ہے جہاں اس کا "نالا کپیا" جاتا ہے اور وہ باہر کی دنیا میں آکر بتدریج اس کے معاملات میں اُلجھ جاتا ہے۔ پھر وہ شعور کی منزل کو پہنچ کر زندگی اور غم ("ملٹے") کو ایک ہی شے جاننے لگتا ہے اور واپس جانے کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے ماں کے پیٹ کو واپسی محال ہے۔ قاری کو یاد آجائے گا کہ فرید نے بیاہ کی علامت یا سمبل موت کے لیے بھی برتی ہے: " جند ووہٹی مرن ور، لے جاسی پرناء" (شلوک ۱)

ਕਲਰ ਕੇਰੀ ਛਪੜੀ ਆਇ ਉਲਥੇ ਹੰਝ ॥
ਚਿੰਜੂ ਬੋੜਨ੍ਹਿ ਨ ਪੀਵਹਿ, ਉਡਣ ਸੰਦੀ ਡੰਝ ॥੬੪॥ ٦٤

کلر کیری چھپڑی آءِ اُلتھے ہنجھ
چنجو بوڑنھ نہ پیوہ اُڈن سندی ڈنجھ

کلر = نمک، شور / کیری = کی / چھپڑی = بارش کے پانی کا ناصاف چھوٹا جوہڑ / اُلتھے = پنجابی لفظ لتھے کی دوسری شکل۔ اُترے / ہنجھ = ہنس / چنجو = چونچ کو / بوڑن = ڈبوئیں، ڈبوتے ہیں / سندی = کی / ڈنجھ = خواہش، پیاس۔

شور زمین کا جوہڑ ہے اور اس میں کچھ ہنس آن اُترے ہیں۔ وہ اس کے ناپاک پانی میں اپنی چونچ ڈبوتے تو ہیں لیکن اسے پیتے نہیں۔ انہیں تو وہاں سے اُڑ جانے کی شدید خواہش لگ رہی ہے۔

یہاں ہنس کی علامت اُن بے نیاز ہستیوں کے لیے استعمال ہوئی ہے جو ہمارے خود غرض معاشرے میں پیدا تو ضرور ہوئے ہیں لیکن وہ (باوجود اپنی اعلیٰ قابلیتوں کے) اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور مال و زر اکٹھا نہیں کرتے۔ اُن کی بڑی خواہش یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح اس بے درد معاشرے سے الگ ہوجائیں۔ انگریزی زبان کا ایک محاورہ In the world but not of it ایسے ہی انسانوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

ਹੰਸੁ ਉਡਰਿ ਕੋਧ੍ਰੈ ਪਇਆ, ਲੋਕੁ ਵਿਡਾਰਣਿ ਜਾਇ ॥
ਗਹਲਾ ਲੋਕੁ ਨ ਜਾਣਦਾ ਹੰਸੁ ਨ ਕੋਧ੍ਰਾ ਖਾਇ ॥੬੫॥ ۶۵

ہنسُ اُڈرِ کودھرے پیا لوکُ وِڈارنِ جاءِ
گِہلا لوکُ ن جاندا ہنسُ ن کودھرا کھاءِ

اُڈر = اُڑکر/ کودھرے = کودھرے کے کھیت ہیں۔ کودھرا باجرے کی قسم کا ایک ادنی قسم کا اناج ہوتاہے۔/ وڈارن = اُڑانے کے لیے/ گہلا = بے سمجھ۔

ہنس اُڑکر کودھرے کے کھیت میں جابیٹھا جہاں (بے درد) لوگ اس کے تعاقب میں جاپہنچے تاکہ اسے وہاں سے بھی اُڑا دیں۔ لیکن ان بے سمجھ لوگوں کو اتنا بھی پتا نہیں کہ ہنس تو کودھرا کھاتا ہی نہیں (روائت کے مطابق ہنس صرف موتی کھاتاہے)

یہ شلوک پچھلے شلوک کے معنوں کو آگے لے جاتاہے اور مناسب یہ ہے کہ شلوک ۶۴ اور ۶۵ کے چار مصرعوں کو ایک قطعہ سمجھ کر پڑھا جائے۔ معلوم نہیں گندے جوہڑ کے بعد کودھرے کا کھیت کس ماحول کا نمائندہ ہے۔ لیکن اتنا تو ظاہر ہے کہ دنیادار لوگ کسی بے طمع اور بے نیاز انسان سے محض اس لیے بھی عداوت کرنے لگتے ہیں کہ یہ بے طمع بھی کیوں ہے؛ وہ اس کی بے طمع زندگی کو اپنے گھٹیا کردار پر ایک خاموش طنز سمجھ کر اس کے دشمن بن جاتے ہیں۔ آخر سیدنا عیسےٰ کو، اُن پر درُود اور سلام ہو، معاصرین نے کیوں صلیب پر لٹکایا؟ اسی لیے نا کہ وہ اس مال و دولت کو، جو اُن معاصرین کی عزیز ترین متاع تھی اور جس کا جمع کرنا ان کا آئیڈیل تھا، مٹی سے بھی کم قدر سمجھتے تھے۔

ਚਲਿ ਚਲਿ ਗਈਆਂ ਪੰਖੀਆਂ ਜਿਨੀ ਵਸਾਏ ਤਲ ॥
ਫਰੀਦਾ ਸਰੁ ਭਰਿਆ ਭੀ ਚਲਸੀ ਥਕੇ ਕਵਲ ਇਕਲ ॥੬੬॥ ۶۶

چلِ چلِ گئیاں پنکھیا جنی وسائے تل
فریدا سرُ بھریا بھی چلسی تھکے کوَل اِکل

پنکھیاں = پنچھیوں کی قطاریں/ وسائے = بسائے یا پُر رونق کیا/ تل = تالاب/ سَر = سرور، جھیل، تالاب/ چلسی = چلا جائے گا۔ سُوکھ کر ناپید ہوجائے گا/ کوَل = کنول/ اکل = اکیلا۔

پرندوں کی قطاریں جنھوں نے تالاب کو اپنے آنے سے رونق دی تھی، اُڑ اُڑ کر چلی گئیں۔ یہ بھرا ہوا تالاب خود بھی (وقت کے ساتھ) خشک ہوجائے گا؛ اور کنول کا پھول اکیلا رہ جائے گا۔

بستیوں کے اُجڑنے، آبادیوں کے خراب ہونے، شہر کی راتوں کی ہنگامہ خیز محفلوں کے سُونا رہ جانے اور ریگستانوں میں راحلۂ آخرِ شب میں خیموں سے راکھ اُبھرنے کے بہت نقشے ہماری شاعری میں ملتے ہیں، لیکن فرید کی بے مثل طرزِ حیات اور منفرد نظر نے خرابی کی یہ کیفیت تالاب کو اپنی چہکاروں سے زندہ کر دینے والے پنچھیوں کے ورُود و وداع میں دیکھ پائی ہے۔ اگر تالاب کو رونق دینے والے سب رکن بلا امتیاز آتے اور چلے جاتے تو پھر بھی درد کی ایک کسک فضا میں چھوڑ جاتے، لیکن فن کار فریدؒ نے اس درد کو اور تیکھا اور گہرا کرنے کے لیے کنول کا شاہد باقی رکھا ہے جو اپنے اکلاپے میں گزرے ہوئے ہنگامہ ہائے ہاؤ ہُو کا ماتمی ہے۔

شاید یہ کنول نوّد سالہ فرید خود ہے جس کے رفیق ایک ایک کرکے راہیِ راہِ عدم ہوچکے ہیں اور اب وہ اُن کے ماتم کو اکیلا باقی رہ گیا ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਇਟ ਸਿਰਾਣੇ, ਭੁਇ ਸਵਣੁ, ਕੀੜਾ ਲੜਿਓ ਮਾਸਿ ॥
ਕੇਤੜਿਆ ਜੁਗ ਵਾਪਰੇ ਇਕਤੁ ਪਇਆ ਪਾਸਿ ॥੬੭॥ ۶۷

فریدا اِٹ سِرانے بھوءِ سَوَن کیڑا لڑیو ماس
کیتڑیا جُگ واپرے اِکتُ پیا پاس

بھوئیں = بھُوم پر ، زمین پر / لڑیو ماس = ماس (جسم) کو کاٹتے ہیں / کینتڑیاں جُگ = کئی جگ - ایک بہت طویل عرصہ - ہندو حساب کے مطابق دُنیا چار جُگ میں منقسم ہے جن میں سے ہر ایک جگ کا زمانہ لاکھوں سال ہوتا ہے / واپرے = گزر گئے / اکت = ایک / پاس = پنجابی پاسا ، پہلو -

(اس شلوک میں قبر میں پڑے ہوئے مُردے کی حالت بیان ہوئی ہے) - مُردے کے سرہانے تکیے کی جگہ اینٹ ہے - اُس کا سونا زمین پر ہے اور کیڑے جسم کے گوشت کو کاٹتے رہتے ہیں - اسے ایک ہی پہلو پر پڑے کئی جگ گزر جاتے ہیں -

ਫਰੀਦਾ ਭੰਨੀ ਘੜੀ ਸਵੰਨਵੀ, ਟੂਟੀ ਨਾਗਰ ਲਜੁ ॥
ਅਜਰਾਈਲੁ ਫਰੇਸਤਾ ਕੈ ਘਰਿ ਨਾਠੀ ਅਜੁ ॥੬੮॥

٦٨
فریدا بھنی گھڑی سَوَنوِی ٹُوٹی ناگر لجُ
اجرائیل فریستا کے گھرِ ناٹھی اجُ

بھنّی = بھن دی ، توڑ دی - یہاں بھنّی کا تقابل "ٹُٹّی" سے ہے - لیکن ٹُٹّی کے معنی "ٹوٹی ہوئی" ہے نہ کہ "توڑ دی" - اس لیے بھنّی کے معنی "بھجّی یا ٹوٹی ہوئی" سمجھنے پڑیں گے - دونوں افعال کی فارم ایک ہی ہونی چاہیے تھی لیکن یہاں نہیں ہے - اگر کوئی چاہے تو بھجّی گھڑی سوئوی پڑھ سکتا ہے / گھڑی = چھوٹا گھڑا ، صراحی ، ظرف - ہماری شاعری میں انسانی جسم کو اکثر ظرف کہا گیا ہے / سَوَنوی = اچھے رنگ والی - وَن رنگ کو کہتے ہیں لہذا سَوَن اچھا رنگ اور سَوَنوی اچھے رنگ والی ہوئی / اجرائیل = عزرائیل ، موت کا فرشتہ - وہ فرشتہ جو انسانوں کی جان قبض کرتا ہے / کے گھر = کس گھر / ناٹھی = مہمان / ناگر = خوبصورت ، نازک / لج = رسّی ، رشتہ - یہاں اس سے مراد رشتۂ نفس ہے -

یہ ٹوٹی ہوئی خوش رنگ صراحی اور یہ شکستہ نازک ڈوری ! آج موت کا فرشتہ عزرائیل کس کے گھر مہمان ہوا ہے !

ایسے معلوم ہوتا ہے کہ فرید کی نظر کسی حسین اور جوان شخص کی میت پر پڑی ہے جس سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ اُن پر یہ شعر وارد ہوا - حسین بدن کو سَوَنوی گھڑی اور جوانی میں ٹوٹ جانے والے تارِ نفس کو "ناگر لج" کہا گیا ہے - "کیں گھر" کو سوال نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ شاعر کو تو غالباً پہلے ہی معلوم ہوگا کہ مرنے والا کون ہے اور کس گھر کا فرد ہے - "کیں گھر" کو صدمے اور افسوس کا اظہار سمجھنا چاہیے ، یعنی عزرائیل آیا تو کس گھر آیا !

قطع نظر معانی کے مُبہم ہونے کے شعر میں ، خصوصاً اس کے پہلے مصرعے میں ، مشدد الفاظ کا زور ، روانی اور صَوتی حسُن لائق تحسین ہے - ایسے خوبصورت مصرعے کم دیکھنے میں آتے ہیں - اور پھر خوبصورتی خود ایک معنیٰ ہے -

ਫਰੀਦਾ ਭੰਨੀ ਘੜੀ ਸਵੰਨਵੀ, ਟੂਟੀ ਨਾਗਰ ਲਜੁ ॥
ਜੋ ਸਜਣ ਭੁਇ ਭਾਰੁ ਥੇ, ਸੇ ਕਿਉ ਆਵਹਿ ਅਜੁ ॥੬੯॥

٦٩
فریدا بھنی گھڑی سَوَنوِی ٹُوٹی ناگر لجُ
جو سجن بھُءِ بھارُ تھے سے کیو آوہِ اجُ

بھوئیں = بھُومی ، زمین / تھے = بعض اُردو متنوں میں اس لفظ کو "تھئے" بنا دیا ہے جس کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی -

یہ ٹوٹی ہوئی خوش رنگ صراحی اور یہ شکستہ نازک ڈوری ! جو دوست زمین کا بوجھ تھے وہ آج کیوں آئیں -

شلوک کا پہلا مصرعہ پچھلے شلوک کی طرح موت ہی کا بیان کرتا ہے دوسرے مصرعے کے معنی ازحد مبہم ہیں - مرنے کے بعد جب کسی کا دنیا میں دوبارہ آنا قطعاً ناممکن ہے تو پھر

یہ کہنا کہ وہ کیوں آئے یا کیوں نہ آئے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کسی شارح نے اس شلوک کی کوئی معقول تشریح نہیں کی۔

ਫਰੀਦਾ ਬੇਨਿਵਾਜਾ ਕੁਤਿਆ ਏਹ ਨ ਭਲੀ ਰੀਤਿ ॥
ਕਬਹੀ ਚਲਿ ਨ ਆਇਆ ਪੰਜੇ ਵਖਤ ਮਸੀਤਿ ॥੭੦॥

٨٠
فریدا بے نِواجا کُتیا ایہہ نَ بھلی رِیتِ
کبھی چلِ نَ آئیا پنجے وکھت مَسِیتِ

کُتیا = اے کُتّے ! / ریت = رسم، طریق / پنجے وقت = پانچوں وقت۔ فرض نمازیں پانچ ہیں اور ان کا مسجد میں ادا کرنا زیادہ ثواب رکھتا ہے۔

اے بے نماز کُتّے ! یہ طریق اچھا نہیں (جو تُو نے کاہلی سے اختیار کر رکھا ہے) کہ تو کسی دن بھی پانچوں وقت نماز کے لیے مسجد چل کر نہیں آیا۔

تمام شارحین نے فرید جیسی قابلِ احترام ہستی کو اشارتاً بھی کُتّے سے نسبت دینا بے ادبی سمجھا ہے چنانچہ انہوں نے "فریدا بے نماز کُتیا" کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ فرید بے نمازوں کو کُتّا کہہ رہے ہیں، اپنے آپ کو نہیں۔ لیکن ان شارحین نے جان بُوجھ کر آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے کہ یہاں تو صاف "فریدا" لکھا ہُوا ہے جو کلمۂ خطاب ہے۔ شاید وہ ہماری شعری روایت سے بے خبر ہیں جس میں شاعر، عاشق اور مرید اپنے آپ کو کُتّا یا کسی کے در کا کُتّا کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔

ہمارے تو بعض نام تک ایسے ہیں جن میں اپنے آپ کو کُتّا کہا گیا ہے مثلاً کلب علی اور کلبِ عباس وغیرہ۔

اس شلوک سے ملتا جلتا ایک شعر مشہورِ عوام ہے اور اکثر سُنا جاتا ہے۔ اُٹھ فریدا سُتیا جھاڑو دے مسیت تُوں سُتا رب جاگدا، تیری ڈاہڈے نال پریت

ਉਠੁ ਫਰੀਦਾ ਉਜੂ ਸਾਜਿ ਸੁਬਹ ਨਿਵਾਜ ਗੁਜਾਰਿ ॥
ਜੋ ਸਿਰੁ ਸਾਂਈ ਨਾ ਨਿਵੈ ਸੋ ਸਿਰੁ ਕਪਿ ਉਤਾਰਿ ॥੭੧॥

٨١
اُٹھُ فریدا اُجُو سَاجِ صُبح نِواج گُجار
جو سِرُ ساں ئی نا نِوَے سو سِرُ کپِ اُتار

اُجُو ساز = وضُو کر۔ گورمکھی میں اُجو ساج لکھا ہے جو بالکل متروک نہیں اور کبھی کبھی سُنا جاتا ہے / نِوے = جھکے / صُبح نماز = اسم بھی ہو سکتا ہے یعنی نمازِ صبح اور جملہ بھی "صبح کے وقت نماز (گزار)" / کپ اُتار = کاٹ کر اُتار دے۔

اے فرید اُٹھ (سونا ختم کر اور) وضو کر کے فجر کی نماز پڑھ۔ جو سر اپنے مالک (خدا) کے آگے نہیں جھکتا (بہتر ہے کہ) وہ سر کاٹ کر اُتار دیا جائے۔

معنی صاف ہیں۔

ਜੋ ਸਿਰੁ ਸਾਈ ਨਾ ਨਿਵੈ ਸੋ ਸਿਰੁ ਕੀਜੈ ਕਾਂਇ ॥
ਕੁੰਨੇ ਹੇਠ ਜਲਾਈਐ ਬਾਲਣ ਸੰਦੈ ਥਾਇ ॥੭੨॥

٨٢
جو سِرُ سائی نا نِوَے سو سِرُ کیجے کاءِ
کُنّے ہیٹھ جلائیے بالن سندے تھاءِ

کاءِ = کیا / کُنّے = ہانڈی / بالن = ایندھن / سندے = کے۔

جو سر اپنے سائیں (خدا) کے آگے نہیں جھکتا اس سر کا کیا کیجئے۔ (بہتر ہے کہ) اسے ہانڈی کے نیچے ایندھن کی جگہ جلایا جائے۔
معنی صاف ہیں۔ مزید تشریح درکار نہیں۔

ਫਰੀਦਾ ਕਿਥੈ ਤੈਡੇ ਮਾਪਿਆ, ਜਿਨ੍ਹੀ ਤੂ ਜਣਿਓਹਿ ॥
ਤੈ ਪਾਸਹੁ ਓਇ ਲਦਿ ਗਏ, ਤੂੰ ਅਜੈ ਨ ਪਤੀਣੋਹਿ ॥੭੩॥

۷۳
فریدا کِتھے تَیڈے ماپیا جِنی توُ جنِیوہِ
تَے پاسہُ اوءِ لدِ گئے توُ اجے نَ پتِینوہِ

تیڈے = تیرے / جنہیں، جنھوں نے / تُن جنیوں = تجھے جنم دیا / تَیں پاسوں = تیرے پاس سے / لد گئے = چلے گئے پتینوں = تیری تسلی ہوئی۔ تو سمجھا۔
اے فرید وہ تیرے ماں باپ کہاں گئے جنھوں نے تجھے جنم دیا تھا۔ تیرے پاس سے وہ چلے گئے لیکن تجھے ابھی تک سمجھ نہیں آئی (کہ جس طرح وہ چلے گئے تجھے بھی جانا ہے)۔
جنیوں (جنی اوں) کے لیے پتینوں (پتی نوں) کا قافیہ محلِ نظر ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਮਨੁ ਮੈਦਾਨੁ ਕਰਿ ਟੋਏ ਟਿਬੇ ਲਾਹਿ ॥
ਅਗੈ ਮੂਲਿ ਨ ਆਵਸੀ ਦੋਜਕ ਸੰਦੀ ਭਾਹਿ ॥੭੪॥

۷۴
فریدا منُ مَیدانُ کرِ ٹوئے ٹِبے لاہِ
اَگَے مُولِ نَ آوسی دوجک سنّدی بھاہِ

میدان کر = میدان کی طرح ہموار کر / ٹوئے = گڑھے / ٹبے = اُبھری ہوئی جگہ / مُول = بالکل / سندی = کی / بھاہ = آگ۔
اے فرید اپنے دل کو میدان (کی طرح ہموار) کر اور اس میں جو اونچ نیچ ہے اسے دُور کر (اگر یہ کرو گے) تو تمہارے آگے دوزخ کی آگ بالکل نہیں آئے گی، یعنی تم اس سے بچے رہو گے۔
من یا دل کی اُونچ نیچ دُور کرکے اسے ہموار کرنے سے مراد غالباً یہ ہے کہ دِل کو ایسا بنایا جائے کہ اس کے لیے دنیا کی لذتیں اور تکلیفیں ایک جیسی ہو جائیں۔ ایسی رُوح یا من دنیا اور آخرت کے عذاب سے محفوظ رہے گا۔ یونانی اور ہندی تہذیبوں میں کئی فلسفیوں نے رنج و غم سے بے نیاز طبیعت پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਖਾਲਕੁ ਖਲਕ ਮਹਿ, ਖਲਕ ਵਸੈ ਰਬ ਮਾਹਿ ॥
ਮੰਦਾ ਕਿਸ ਨੋ ਆਖੀਐ, ਜਾਂ ਤਿਸੁ ਬਿਨੁ ਕੋਈ ਨਾਹਿ ॥੭੫॥

۷۵
فریدا کھالکُ کھلک مَہِ کھلک وسّے رب ماہِ
منّدا کِس نو آکھِیَے جاں تِسُ بِنُ کوئی ناہِ (گرُو ارجن)

خالق = جو پیدا کرے، خدا / خَلق = جو پیدا ہو، مخلوق، بندہ / وَسے = بسے، بستی ہے / ماہ = میں / مندا = بُرا / تِس = اُس۔
اے فرید! خالق (خدا) اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق میں بستا ہے اور مخلوق رب میں بستی ہے (جب یہ صورت ہے تو) بُرا کسے کہہ سکتے ہیں کیونکہ خدا کے بغیر تو کوئی دوسرا ہے ہی نہیں۔
یہ شلوک گرُو ارجن دیو کا ہے جو بظاہر فلسفۂ وحدۃ الوجود یا ہمہ اوست کے قائل ہیں۔ اگرچہ بہت سے مسلمان صوفی ہمہ اوست کا عقیدہ رکھتے ہیں لیکن فرید کے کلام میں کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا جس سے ظاہر ہو کہ وہ بھی یہ مسلک رکھتے تھے۔ مسلمانوں میں اس مسلک کے پیشرو شیخ الاکبر محی الدین ابن العربی (۱۱۶۵ء — ۱۲۴۰ء) ہیں جو سپین کے باشندے تھے اور جن کی مشہو

کتاب فصوص الحکم ۱۲۳۳ء میں لکھی گئی - اس زمانے کی اسلامی دنیا میں نئے خیالات بڑی تیزی سے مُلکوں مُلکوں پھیل جاتے تھے اس لیے فرید کا اس فلسفے سے بے خبر رہنا قرین قیاس نہیں، تاہم وہ اس کے قائل نظر نہیں آتے - البتہ رُومی (۱۲۰۷ء - ۱۲۷۲ء) جو اُن کے ہمعصر تھے اس کے قائل ہیں - پنجاب میں بُلھے شاہ وحدۃ الوجود کے زبردست مؤید تھے اور ان کی طرح خواجہ غلام فرید (وفات ۱۹۰۱ء) بھی، جو فرماتے ہیں: " مُلّوانے دے وعظ نہ بھانے بے شک ساڈا دین ایمانے ابن العربی دا دستور"

شلوک کا مرکزی خیال یہ ہے کہ کسی کو، یہاں تک کہ دشمن کو بھی، بُرا نہیں کہنا چاہیے کیونکہ سب میں خالق ہی کی روح بستی ہے - ہر صورت وِچ دیدار ڈِٹھم سب یار اغیار کو یار ڈِٹھم (خواجہ غلام فرید)

ਫਰੀਦਾ ਜਿ ਦਿਹ ਨਾਲਾ ਕਪਿਆ ਜੇ ਗਲੁ ਕਪਹਿ ਚੁਖ ॥
ਪਵਨਿ ਨ ਇਤੀ ਮਾਮਲੇ ਸਹਾਂ ਨ ਇਤੀ ਦੁਖ ॥੭੬॥

۷۶

فریدا جِ دِہ نالا کپیا جے گل کپہ چُکھ
پوَنِ نَ اِتی مامِلے سہاں نَ اِتی دُکھ

نالا = ناڑا، آنول نال - وہ نال جس سے بچہ پیدائش سے پہلے ماں کے رِحم سے پیوستہ ہوتا ہے اور بے محنت خوراک حاصل کرتا ہے - اسے پیدائش پر کاٹ دیا جاتا ہے اور بچہ ماں کے جسم سے الگ ہو جاتا ہے - اس کے بعد اُسے خوراک کے حصول کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے خواہ وہ پستان چُوسنے ہی کی کیوں نہ ہو / گَل = گلا / چُکھ = ذرا سا / پوَن = پڑتے / اِتی = اتنے / مامِلے = لفظ معاملے کی پنجابی شکل - مراد کشمکشِ حیات کے معاملات - زندگی میں نہ صرف فرد کی اپنی طبیعت کے مختلف مَیلانات میں تصادم رہتا ہے بلکہ اس کے گرد کی بیرونی دنیا کی روئیں بھی اُن سے متصادم ہوتی ہیں - ان سب کو فرید نے " مامِلے " کہا ہے - ظاہر ہے کہ جو انسان ان میں پکڑا جائے گا وہ دُکھی ہوگا -

جس دن میرا ناڑا کاٹا گیا (یعنی جس دن میں پیدا ہوا) اگر اسی دن میرا گلا بھی کاٹ ڈالتے (یعنی مجھے مار ڈالتے) تو میں اس دنیا کے معاملوں میں نہ پکڑا جاتا اور اتنے دکھ نہ سہتا۔

بعض فلسفیوں نے فرد کے ماں کے پیٹ سے الگ ہونے کو ازل کے دن رُوحِ انسان کے رُوحِ کل کے سے الگ ہونے کے مثل بتایا ہے - ماں کے پیٹ میں بچے کو ہر آسائش بے محنت حاصل ہوتی ہے اس لیے انھوں نے ماں کے پیٹ ہی کو جنت قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ لاشعوری طور پر انسان پھر اسی جنت کو واپس جانا چاہتا ہے - کم از کم وہ اِس دنیائے محنت آباد کو اپنا اصلی وطن نہیں سمجھتا - دنیا دی "مامِلوں" کے جنجال کے احساس والا انسان اتنا دکھی ہوتا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ وہ پیدا ہی نہ ہوتا اور اس دنیا میں نہ آتا۔

ਚਬਣ ਚਲਣ ਰਤੰਨ, ਸੇ ਸੁਣੀਅਰ ਬਹਿ ਗਏ ॥
ਹੇੜੇ ਮੁਤੀ ਧਾਹ, ਸੇ ਜਾਨੀ ਚਲ ਗਏ ॥੭੭॥

۷۷

چبنْ چلنْ رتن سے سُنئیر بہِ گئے
ہیڑے مُتی دھاہ سے جانی چلِ گئے

چبّن = چابنا، مُراد دانت / چلن = چلنا، مراد ٹانگیں / رتن = دیکھنا، مراد آنکھیں / سے = وہ / سُنیئر = سننے والے، مراد کان / مُتّی = ماری / دھاہ = ڈھائیں -

(جب بڑی عمر میں) چبانا (دانت)، چلنا (ٹانگیں)، دیکھنا (آنکھیں) اور سننے والے (کان) بھی گئے تو دِل نے ڈھائیں ماریں کہ میرے پیارے گئے -

بڑھاپے میں جو تکلیفیں انسان کو لاحق ہوتی ہیں اُن کا ذکر بابا فرید غالباً اپنے ذاتی تجربے سے کر رہے ہیں - قویٰ کے کمزور ہو جانے سے دِل پر بڑا صدمہ گزرتا ہے کیونکہ دنیا کے کام

تو الگ رہے اب خدمتِ خلق اور عبادت بھی نہیں ہو سکتی۔

ਫਰੀਦਾ ਬੁਰੇ ਦਾ ਭਲਾ ਕਰਿ ਗੁਸਾ ਮਨਿ ਨ ਹਢਾਇ ॥
ਦੇਹੀ ਰੋਗੁ ਨ ਲਗਈ ਪਲੈ ਸਭੁ ਕਿਛੁ ਪਾਇ ॥੭੮॥

۷۸

فریدا بُرے دا بھلا کرِ گسّا منِ نَ ہڈھاءِ
دیہی روگُ نَ لگ ای پلے سبھُ کِچھُ پاءِ

بُرے = بُرے آدمی / نہ ہنڈا = نہ آنے دے / دیہی = جسم کو / لگت ای = لگے گا / پلّے پا = پلّے باندھ لے، سمیٹ لے۔

اے فرید! جو تجھ سے برائی بھی کرے تو اس کا بھلا کر اور اپنے دِل میں غصہ نہ آنے دے۔ (اس کا نتیجہ یہ ہوگا) کہ تمہارے جسم کو کوئی روگ نہیں لگے گا۔ (اس کے علاوہ تم دیکھو گے کہ اس سے تم پر رُوحانی برکتیں نازل ہونے لگتی ہیں) تم اُن سب کو سمیٹ لو (یہ تمہارا حصہ ہیں)۔

دشمنوں اور بُرے لوگوں سے بھلائی برتتے رہنا دِل میں اطمینان پیدا کرتا ہے اور یہ ایک سچائی ہے کہ مطمئن دِل جسم کو روگ نہیں لگنے دیتا۔ صحت مند جسم تو ایک نعمت ہے ہی لیکن جو روحانی برکتیں اس کے علاوہ ملتی ہیں وہ الگ ہیں۔

ਫਰੀਦਾ ਪੰਖ ਪਰਾਹੁਣੀ ਦੁਨੀ ਸੁਹਾਵਾ ਬਾਗੁ ॥
ਨਉਬਤਿ ਵਜੀ ਸੁਬਹ ਸਿਉ ਚਲਣ ਕਾ ਕਰਿ ਸਾਜੁ ॥੭੯॥

۷۹

فریدا پنکھ پراہُنی دُنی سُہاوا باگ
نوبتِ وجی سبح سیو چلݨ کا کرِ ساجُ

پنکھ = پنچھیوں کی ڈار، پرندوں کی قطار یا جُھنڈ / پروہنی = مہمان / دُنی = دنیا / سہاوا = سہانا، خوبصورت / نوبت = وہ نقارہ جو مخصوص اوقات پر بجایا جاتا ہے / سیوں = ساتھ / ساج = ساز، سامان۔

اے فرید، پرندوں کا یہ جُھنڈ (یعنی انسان) جن میں تم بھی شامل ہو دنیا کے سُہانے باغ میں مہمان بن کر شب بسری کے لیے اُترا تھا۔ اب صبح کے ساتھ جو نوبت بج رہی ہے تو تم بھی یہاں سے کوچ کی تیاری کرو۔

پرندے نقلِ وطن کرتے ہیں تو سفر میں ایک رات سے زیادہ کہیں نہیں ٹھہرتے۔ انسان کا قیام بھی دُنیا میں بہت مختصر ہے۔ اسے دُنیا سے چلنے کی تیاری اسی طرح کرنی چاہیے جس طرح پرندے رات ختم ہوتے ہی سفر پر چلنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

ਫਰੀਦਾ ਰਾਤਿ ਕਥੂਰੀ ਵੰਡੀਐ ਸੁਤਿਆ ਮਿਲੈ ਨ ਭਾਉ ॥
ਜਿੰਨ੍ਹਾ ਨੈਣ ਨੀਂਦ੍ਰਾਵਲੇ ਤਿਨ੍ਹਾ ਮਿਲਣੁ ਕੁਆਉ ॥੮੦॥

۸۰

فریدا راتِ کتھوری وَنڈِیئے، سُتیا ملے نَ بھاؤ
جنا نیݨ نیندراولے تِنا مِلݨ کُآؤ

کھتُوری = یہ لفظ کستوری کی دوسری شکل ہے / ونڈیئے = بانٹیے ۔ بانٹی جاتی ہے / بھاؤ = حصہ / نین نیندراولے = نیند بھرے نین، سوئی ہوئی آنکھیں / کواؤ = کس طرح

رات کو (عبادت کے لیے جاگنے والوں میں) کستوری بٹتی ہے، لیکن سوتے ہوئے غافلوں کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ جن کی آنکھیں نیند سے بند ہیں انہیں کوئی حصہ مل بھی کیسے سکتا ہے۔

راتوں میں عبادت کے لیے جاگنے کی فضیلت عام طور پر تسلیم کی گئی ہے۔ فرید کہتے ہیں کہ ایسے شب زندہ داروں کو کستوری سے حصہ ملتا ہے۔ کستوری ایک خوشبودار شے ہے جس سے اس جگہ مراد خدا کی خوشنودی یا خدا کی طرف سے انعام یا خدا کی نزدیکی کا احساس ہو سکتا ہے۔ سُلطان باہوؒ نے اِس شے کو "چنبے دی بُوٹی دی مُشک" کہا ہے۔ رات کی خاموشی اور سکون میں جس یکسوئی سے ذکر و فکر ہو سکتا ہے وہ دن کے وقت ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ رات کے سکون میں اِدھر کا رُخ ہی نہیں کرتے انہیں یہاں سے کس طرح اور کیا حصہ ملے گا۔

ਫਰੀਦਾ ਮੈ ਜਾਨਿਆ ਦੁਖੁ ਮੁਝ ਕੂ, ਦੁਖੁ ਸਬਾਇਐ ਜਗਿ ॥
ਊਚੇ ਚੜਿ ਕੈ ਦੇਖਿਆ,ਤਾਂ ਘਰਿ ਘਰਿ ਏਹਾ ਅਗਿ ॥੮੧॥

۸۱

فریدا مَے جانیا دُکھُ مُجھ کوُ دُکھُ سبائیے جگِ
اُوچے چڑِ کے دیکھیا تاں گھرِ گھرِ ایہا اگِ

مَیں جانیا = میں نے جانا تھا / سبھائے = سارے / جگ = جہان، دنیا، دنیا کے انسان / اُچے = اونچی جگہ۔ یہاں اُونچائی سے مُراد مادی اور رُوحانی ہر دو قسم کی بلندی ہے

میں نے جانا تھا کہ دُکھ صرف مجھی کو ملا ہے لیکن دُکھ تو ساری دنیا کے انسانوں کا حِصہ ہے۔ جب میں نے بلندی پر چڑھ کر نیچے (دنیا کی بستیوں پر) نظر ڈالی تو دیکھا کہ وہاں کے ہر گھر سے دُکھ کی آگ کا دُھواں اُٹھ رہا ہے۔

عام آدمی کو اپنی ہر شے خاص معلوم ہوتی ہے لیکن اگر انسان اپنے نفس کو پہچاننے لگے تو اسے نظر آجاتا ہے کہ اُس کے احساسات، خواہشیں اور مایوسیاں دوسرے انسانوں سے مختلف نہیں ہیں۔ دوسروں کے روزگار اور روزگار کے غم ویسے ہی ہیں جیسے کہ اُس کے اپنے ہیں۔

اس شلوک میں اُچے کا لفظ نہایت درجہ بلیغ ہے۔ آپ کسی بستی میں گلی کوچے کی سطح پر ہوں تو آپ کو ساری بستی نظر نہیں آتی لیکن اگر آپ بستی کے نزدیک کسی پہاڑ کی اونچائی پر چڑھ جائیں تو آپ کو سارے گھر بیک وقت نظر آنے لگتے ہیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ ہر گھر سے دُھواں اُٹھ رہا ہے جو اس کے اندر کی آگ کی نشان دہی کرتا ہے۔ اسی طرح جو انسان روحانی طور پر بلند ہوتا ہے اُس پر دوسروں کے مخفی حالات بھی کھلنے لگتے ہیں اور وہ جاننے لگتا ہے کہ دُکھ درد صرف اُسی کا حصہ نہیں بلکہ سبھی اس میں یکساں مبتلا ہیں۔ اب وہ سمجھنے لگتا ہے کہ دُکھ درد اولادِ آدم کا ورثہ ہے چنانچہ وہ اپنے ورثے کو صبر شکر کے ساتھ قبول کرتا ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਭੂਮਿ ਰੰਗਾਵਲੀ ਮੰਝਿ ਵਿਸੂਲਾ ਬਾਗ ॥
ਜੋ ਜਨ ਪੀਰਿ ਨਿਵਾਜਿਆ ਤਿੰਨ੍ਹਾ ਅੰਚ ਨ ਲਾਗ ॥੮੨॥

۸۲

فریدا بھُومِ رنگاولی مَنّجھِ وِسُولا باگ
جو جَن پیر نِواجیا تِنا اَنچ نَ لاگ

بھُوم = زمین۔ دُنیا / رنگاولی = رنگ والی، رنگا رنگ، خوشنما / منجھ = میں، درمیان میں / وِسولا = وِس والا، زہریلا / جو جن = جس جنے کو، جسے / پیر = پیرِ طریقت، گرو،

خدا / نواجیا = نوازا، مہربانی کی / آنچ = سینک - یہ شلوک گرو ارجن دیو کا ہے اور وہ فرید سے یہ کہہ رہے ہیں کہ -

اے فرید ! یہ دنیا اگرچہ خوشنما ہے، لیکن اس میں ایک زہریلا (زہریلے پھل دینے والے پودوں کا) باغ بھی ہے (اس کے خوشنما زہریلے پھل کھا کر سب لوگ نقصان اٹھاتے ہیں لیکن) جن خوش قسمت لوگوں پر گرو یا خدا کی نظرِ مہر ہے وہ اس کی آنچ سے بچے رہتے ہیں -

دیکھنے میں یہ دنیا خوبصورت اور خوشیوں سے بھرپور جگہ ہے لیکن اس کی خوشیاں ان معنوں میں زہریلی ہیں کہ ان کے لیے آدمی کو طمع ظلم اور بے انصافیاں کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن جو گرو کی ہدایت یا خدا کی مہربانی سے بے طمع ہو جائیں ان کے لیے دنیا کی رنگینیاں دلکش نہیں رہتیں اور اُن پر اِن سے کوئی آنچ نہیں آتی -

آنچ کے لفظ کا استعمال محلِ نظر ہے کیونکہ بات زہریلے پودے کی ہو رہی تھی - زہر سے آنچ کی طرف آنا کچھ غیر فصیح نظر آتا ہے -

ਫਰੀਦਾ ਉਮਰ ਸੁਹਾਵੜੀ ਸੰਗਿ ਸੁਵੰਨੜੀ ਦੇਹ ॥

ਵਿਰਲੇ ਕੇਈ ਪਾਈਅਨਿ ਜਿੰਨ੍ਹਾ ਪਿਆਰੇ ਨੇਹ ॥੮੩॥

۸۳

فریدا عُمر سُہاوڑی سنگِ سُوَنڑی دیہ

وِرلے کیئی پائیانے جِنھا پیارے نیہ (گرُو ارجن)

سہاوڑی = سُوکھی، آسودہ / سنگ = ساتھ / سُوَنڑی = اچھے رنگ والا، خوبصورت / دیہ = جسم / ورلے = خال خال، تھوڑے / کائی = کوئی / پائیَن = پائے جاتے ہیں / پیارے = محبوب، خدا / نینہ = محبت - یہ شلوک گورو ارجن دیو کا ہے جو فرید سے مخاطب ہیں :

اے فرید، ایسے کوئی تھوڑے پائے جاتے ہوں گے جن کی زندگی آسودہ ہو اور جن کا بدن خوبصورت ہو اور پھر ان کا پیار خدا کے ساتھ ہو -

ترکِ دنیا کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں - ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص پہلے ہی بے زر اور بد صحت ہو اور زندگی سے لطف نہ اٹھا سکتا ہو - اگر ایسا شخص دنیا سے الگ ہو کر عابد زاہد بن جائے تو کوئی کمال نہیں - لیکن جس شخص کو زندگی کا عیش آرام مہیا ہو اور وہ وجیہ بھی ہو، اگر وہ دنیا چھوڑ کر خدا (پیارے) سے لَو لگائے تو البتہ ایک بات ہے لیکن لاکھوں کروڑوں کی آبادی میں سے شاید کوئی ایک مرد ایسا نکل آئے ورنہ نہیں -

ਕੰਧੀ ਵਹਣ ਨ ਢਾਹਿ, ਤਉ ਭੀ ਲੇਖਾ ਦੇਵਣਾ ॥

ਜਿਧਰਿ ਰਬ ਰਜਾਇ, ਵਹਣੁ ਤਿਦਾਊ ਗਉ ਕਰੇ॥੮੪॥

۸۴

کندھی وَہنڑ نَ ڈھاہِ توَ بھی لیکھا دیونڑا

جِدھر رب رجاءِ وہنڑُ تِداؤُ گوَ کرے

کندھی = کنڈھے کو، کنارے کو / وہن = دریا کی تیز رَو - یہاں وہن کو مخاطب کیا جا رہا ہے ؛ اے وہن ! / لیکھا = حساب، عملوں کی جواب دہی / رب رضا = رب کی مرضی / تِداؤں = اُسی طرف / گو = چلے، رُخ کرے -

اے دریا کی تیز رَو ! کنارے کو نہ گرا - تجھے بھی (اپنے اِس فعل کا) حساب دینا پڑے گا - لیکن دریا کی تیز رَو اُدھر ہی چلتی ہے جدھر خدا کی مرضی ہو -

دونوں مصرعوں میں ربط کم نظر آتا ہے - لیکن اگر پہلے مصرعے کو ایک الزام سمجھا جائے جو وہن پر لگایا جا رہا ہے اور دوسرے مصرعے کو وہن کی طرف سے جواب سمجھا جائے تو کچھ بات بنتی ہے - یعنی وہن جواب میں کہتا ہے کہ میں اپنی مرضی سے کناروں کو نہیں ڈھا رہا بلکہ خدا کی مرضی یہی ہے کہ انہیں ڈھایا جائے - یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مصرعوں کے آخر پر اگرچہ

ہم قافیہ الفاظ نہیں لیکن وسرام پر "ڈھا" اور "رضا" ہم قافیہ ہیں۔ بعض اور جگہ بھی یہ صنعت برتی گئی ہے۔

فرید کا بے جان چیزوں سے خطاب کرنا اور اُن کے متعلق اس طرح بات کرنا گویا وہ شعور رکھتی ہوں اور اس سے کوئی اخلاقی سبق اخذ کرنا اور بھی کئی شلوکوں میں دیکھا جائے گا۔ دیکھیں شلوک ۳۹ گھڑیال ندوسا ماریئے؛ شلوک ۴۰ گھڑیئے گھڑیئے ماریئے؛ شلوک ۴۹ دیکھ کپاہے جو تھیا اور شلوک ۸۴ دہن! کندھی نہ ڈھا۔ فرید انگریزی کے شاعر ورڈزورتھ کی طرح پتھروں میں وعظ Sermons in the stones سُن پاتا ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਦੁਖਾ ਸੇਤੀ ਦਿਹੁ ਗਇਆ ਸੂਲਾਂ ਸੇਤੀ ਰਾਤਿ ॥
ਖੜਾ ਪੁਕਾਰੇ ਪਾਤਣੀ ਬੇੜਾ ਕਪਰ ਵਾਤਿ ॥੮੫॥

۸۵

فریدا ڈُکھا سیتی دِہُ گیا سُولاں سیتی راتِ
کھڑا پُکارے پاتنڑ بیڑا کپر واتِ

سیتی = ساتھ / سُولاں = سُول کی جمع، کانٹے۔ درد / پاتنی = جو پتن پر کام کرے، ملاح / کپّر = گھُمّن گھیر / وات = مُنہ

دن دُکھوں میں گزرا اور رات دردوں میں (یا کانٹوں پر)۔ ملاح کھڑا پکار رہا ہے کہ کشتی بھنور کے منہ میں آگئی ہے۔

پہلے اور دوسرے مصرعے میں بظاہر کوئی ربط نظر نہیں آتا سوائے اس کے کہ یہ سمجھا جائے کہ عشاق دن رات تکلیف میں گزارتے ہیں اور برباد بھی وہی ہوتے ہیں یا یہ سمجھا جائے کہ گو دوسرے مصرعے کا تعلق پہلے سے نہیں لیکن وہ اگلے شلوک (۸۶) سے ربط رکھتا۔

ਲੰਮੀ ਲੰਮੀ ਨਦੀ ਵਹੈ ਕੰਧੀ ਕੇਰੈ ਹੇਤਿ ॥
ਬੇੜੇ ਨੋ ਕਪਰੁ ਕਿਆ ਕਰੇ ਜੇ ਪਾਤਣ ਰਹੈ ਸੁ ਚੇਤਿ ॥੮੬॥

۸۶

لمی لمی ندی وَہے کنّدھی کیرَے ہیتِ
بیڑے نوُ کپرُ کیا کرے جے پاتنڑ رہے سُچیتِ

لمی لمی = لمبی / کیرے = کے / ہیت = واسطے / سُچیت = ہوشیار

لمبی ندی چل رہی ہے کنارے (کے گرانے) کے واسطے۔ لیکن بیڑے کا بھنور کچھ بگاڑ نہیں سکتا اگر ملاّح ہوشیار رہے۔

"کندھی کیرے ہیت" کے لُغوی معنی تو "کندھی کے واسطے" ہوں گے لیکن یہاں "گرانے" کا لفظ محذوف ہے۔ مُراد ہے کہ ندی کنارے کے گرانے کے واسطے بہہ رہی ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਗਲੀ ਸੁ ਸਜਣ ਵੀਹ, ਇਕ ਢੂੰਢੇਦੀ ਨ ਲਹਾਂ ॥
ਧੁਖਾਂ ਜਿਉ ਮਾਂਲੀਹ, ਕਾਰਣਿ ਤਿੰਨ੍ਹਾ ਮਾ ਪਿਰੀ ॥੮੭॥

۸۷

فریدا گلیں سُ سجنڑ وِیہ اِکُ ڈُھونڈھیدی نَ لہاں
دُھکھاں جِیُو مالیہہ کارنِ تِنہا ما پِری

گلیں سُو = باتوں سے، کہنے کو / لہاں = پاتی ہوں / دُھکھاں = سُلگتا ہوں / مالیہہ = خشک اُپلوں کا بُرادہ / ما = میرا / پری = پیارا۔

کہنے کو تو میرے بہتیرے سجن ہیں لیکن وہ ایک جسے میں ڈھونڈتی ہوں، اُسے ہی نہیں پاتی ہوں، اگرچہ اس ایک پیارے کی خاطر میں "مالیہہ" کی طرح سُلگ رہی ہوں۔

بعض شارحین نے پہلے مصرعے کا مطلب کچھ اس طرح بیان کیا ہے: "زبانی کلامی تو بیس شخص میری دوستی کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب کوئی کام آپڑتا ہے تو ڈھونڈنے پر ایک بھی نہیں ملتا"۔ یہ معنی تو پہلے مصرعے سے یقیناً پیدا ہوتے ہیں لیکن اس سے پہلے اور دوسرے مصرعے میں ربط پیدا نہیں ہوتا۔

اگرچہ مصرعوں کے آخری الفاظ ہم قافیہ نہیں، لیکن مصرعوں کے درمیان وسرام پر "وِیہہ" اور "مالیہہ" ہم قافیہ ہیں اور غالباً ارادے سے یہاں لائے گئے ہیں۔ شلوک ۸۴ میں "ڈھا" اور "رضا" کی بھی یہی صورت معلوم ہوتی ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਇਹ ਤਨੁ ਭਉਕਣਾ ਨਿਤ ਨਿਤ ਦੁਖੀਐ ਕਉਣੁ॥
ਕੰਨੀ ਬੁਜੇ ਦੇ ਰਹਾਂ ਕਿਤੀ ਵਗੈ ਪਉਣੁ ॥੮੮॥

۸۸
فریدا ایہُ تنُ بھوکنا نِت نِت دُکھیَے کونُ
کنّی بُجے دے رہاں کِتی وگےَ پَونُ

بھوکنا = بھونکنے والا، کُتا / کنّیں = کانوں میں / دُکھیے = دُکھ اُٹھائے / بُجّے = پنبے / کِتی وگے = کتنی ہی تیزی سے کیوں نہ چلے / پَون = ہوا۔ اس کا عام تلفظ تو پَوَن ہے لیکن یہاں قافیے کی خاطر پَون کہا گیا ہے۔

اے فرید یہ تن (مُراد نفس امّارہ) ایک بھونکنے والا کُتا ہے۔ اس سے گھڑی گھڑی کون دُکھ اُٹھائے (یعنی اس کے گھڑی گھڑی کے نئے مطالبے کون سُنے)۔ بہتر ہے کانوں میں پنبہ دے لوں پھر ہوسِ نفس کی ہوا کتنی ہی تیز اور شور مچاتی چلے، چلے (یعنی میں نہ نفس کے مطالبے سُنوں گا اور نہ اُن کے پُورا کرنے میں دُکھ اٹھاؤں گا)۔

ہمارے ادب میں نفس امّارہ کو عام طور پر کُتّے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح کُتا لُقمے کے لیے بھونکتا ہے اور اُس کے کھا چکنے پر نئے لقمے کے لیے پھر بھونکتا ہے، اسی طرح انسان کا نفس لذائذ دُنیوی کے لیے پُرزور مطالبے کرتا رہتا ہے۔ ایک پُورا ہوتا ہے تو دوسرے کے لیے کُتّے کی طرح شور مچانے لگتا ہے۔ آخر کوئی انسان کہاں تک اپنے نفسِ امارہ کے ان مطالبوں کو سُن سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ کانوں میں پنبہ ٹھونس کر بہرا بن جائے۔ پھر نہ مطالبے سنائی دیں گے اور نہ ان کے پُورا کرنے کے لیے دُکھ اُٹھانے پڑیں گے۔

ਫਰੀਦਾ ਰਬ ਖਜੂਰੀ ਪਕੀਆਂ ਮਾਖਿਅ ਨਈ ਵਹੰਨਿ ॥
ਜੋ ਜੋ ਵੰਞੈ ਡੀਹੜਾ ਸੋ ਉਮਰ ਹਥ ਪਵੰਨਿ ॥੮੯॥

۸۹
فریدا رب کھجُوری پکیاں ماکھیا نئی وَہَن
جو جو وَنجّھے ڈِیہڑا سو عُمر ہتھ پَوَنہ

ربّ کھجوریں پکیاں = رب نے کھجوریں پکا دیں۔ رب کے بعد علامتِ فاعل "نے" محذوف ہے / ماکھیا نئیں = ماکھیوں یا شہد کی نہریں۔ ماکھیا کے بعد "کی" محذوف ہے / ونجّھے = گزرے / عُمر = عُمر پر۔ "پر" محذوف ہے۔ ایسے حذف فارسی کی طرح پنجابی میں کثرت سے ہیں۔ ایک اور مثال "شکر گنج" ہے جو شکر دا گنج یعنی شکر دا خزانہ تھا / ہتھ پوَن = ہاتھ ڈالتا ہے۔

خدا نے (اپنے کرم سے) کھجوریں پکا دی ہیں اور شہد کی نہریں چلا دی ہیں۔ لیکن پھر بھی جو دِن گزرتا ہے عُمر پر ہاتھ ڈالتا جاتا ہے۔

شاید یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ جو دِن گزرتا ہے وہ انسانی عُمر کو کم کرتا ہے۔ اس میں شہد اور کھجوروں کی فراوانی ہو یا کھانے تک کو کچھ نہ ملے، ذرا فرق نہیں پڑتا۔ لیکن چونکہ عیش آرام

کے زمانے میں وقت کا گزرنا محسوس نہیں ہوتا اور اس کی دلفریبی مرورِ زمان کے احساس کے لیے ایک پردہ بنی رہتی ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ عیش آرام والوں کو عمر کے گھٹتے چلے جانے، توبہ اور عبادت کے موقعے کم رہتے جانے کی طرف توجہ دلائی جائے۔ ویسے بھی عمر پر ہاتھ پڑنے کی تلخی کو عیش کے مقابلے میں لایا جائے تو یہ تلخی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے اور یہ فنِ شعر کے استعمال کی ایک اچھی مثال ہے۔

یہ بات توجہ کے لائق ہے کہ فرید نے عیش آرام کی زندگی کے لیے جو علامتیں برتی ہیں وہ بہت پیاری ہیں اور پنجاب کے دیہات کی مناسبت سے لائی گئی ہیں۔

ਫਰੀਦਾ ਤਨੁ ਸੁਕਾ, ਪਿੰਜਰੁ ਥੀਆ,ਤਲੀਆ ਖੂੰਡਹਿ ਕਾਗ॥
ਅਜੈ ਸੁ ਰਬ ਨ ਬਾਹੁੜਿਓ ਦੇਖੁ ਬੰਦੇ ਕੇ ਭਾਗ ॥੯੦॥

۹۰

فریدا تنُ سُکا پِنجرُ تِھیا تلیاں کھُونڈہِ کاگ
اَجے سُ ربُ نَ باہُڑیو دیکھُ بنّدے کےَ بھاگ

تن سُکا پنجر تھیا = تن سُوکھ کر پنجر ہو گیا / کھُونڈن = نوچنے لگے۔ ٹھونگیں مارنے لگے / کاگ = کوّے / اجے سُو = ابھی بھی / بُوہڑیو = پہنچا۔

(تلاشِ حق میں بندے کا ریاضتیں کرتے) بدن سُوکھ کر پنجر ہو گیا، یہاں تک کہ کوّوں نے (اسے مردہ یا قریبِ مرگ سمجھ کر) اُس کے تلووں میں ٹھونگیں مارنی شروع کر دیں۔ لیکن واحسرتا کہ ابھی بھی رب نے اس پر اپنا آپ ظاہر نہ کیا۔ دیکھ، یہ ہے بندے کی تقدیر !

انسانی زندگی کے المیے کو جس زور سے فرید نے بیان کیا ہے شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ دنیاوی عزائم اور منصوبے تو خیر ایک طرف رہے؛ وہ پورے ہوتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔ لیکن جو انسان پُورے عزم کے ساتھ اُس رب کی معرفت حاصل کرنے کی طرف مڑتا ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ہر جگہ ہے اور انسان سے اُس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور پھر وہ اپنی سادگی میں مختلف رُوحانی رہبروں کے بتاتے ہوئے سخت چِلّوں اور ریاضت کے طریقوں پر سالوں سال چلتا ہے، یہاں تک کہ وہ ضُعف سے مَوت کے کنارے آن لگتا ہے اور مُردار خور کوّے اور گِدھ اس کے گرد جمع ہونے لگتے ہیں؛ لیکن وا افسوس کہ خدا کی معرفت وہ پھر بھی نہیں پاتا اور اس کا یہ سوال کہ "آخر تُو کیا ہے اسے نہیں ہے" سوال ہی رہتا ہے۔ فرید اِس ناکامی کو بندے کی تقدیر سمجھ کر اسے کنایۃً یہ سمجھاتا ہے کہ بندہ اِسی تقدیر پر راضی ہو جائے اور اس سے سمجھوتا کرے۔

فرید کی مُطلق مایوسی کی اس شلوک سے بہتر مثال نہیں دی جا سکتی۔ تاہم فرید کے کچھ اور شلوک ایسی مایوسی کے برعکس شب زندہ داروں کو عبادتوں کے صِلے میں معرفتِ ربّی کی نوید بھی دیتے ہیں۔ دیکھیے (۱۱۲): "پہلے پہرے پُھلڑا، پھل بھی پچھا رات" اور (۸۰): "رات کتھوری ونڈیئے ....."

اس سلسلے میں شاید یہ کہنا بے مَورد نہ ہو کہ بعض ہادیانِ دین نے سخت ریاضتوں سے منع کیا ہے۔ مثلاً گوتم بدھ نے خود سالہا سال تک سخت ریاضتیں کیں اور پھر انہیں بے کار بتایا۔ رسولِ خدا، علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بعض صحابہ کو سخت ریاضتوں سے منع کیا اور یہ بھی فرمایا کہ خدا کی ذات میں نہیں بلکہ اس کی صفات میں غور و فکر کرو۔ شاید خدا کا براہِ راست مشاہدہ (جسے آجکل کے محاورے میں تجربہ کہتے ہیں) انسان کے لیے ممکن نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام جیسے نبی بالواسطہ بھی اسے نہ دیکھ سکے اور دامنِ طور میں غش کھا کر گر پڑے۔ شاید فرید اپنے لیے وہ کچھ چاہتے تھے جو موسیٰؑ نبی بھی نہیں پا سکے تھے۔ لیکن رب نہ وہاں بُوہڑا تھا نہ یہاں !

ਕਾਗਾ ਕਰੰਗ ਢਢੋਲਿਆ ਸਗਲਾ ਖਾਇਆ ਮਾਸੁ ॥
ਏ ਦੁਇ ਨੈਨਾ ਮਤਿ ਛੁਹਉ ਪਿਰ ਦੇਖਨ ਕੀ ਆਸ ॥੯੧॥

۹۱

کاگا کرنگ ڈھڈھولیا سگلا کھایا ماسُ
ایہ دُءِ نیناں متِ چھہو پِر ویکھن کی آس

کاگا = اے کوّے/کرنگ = ہڈیوں کا پنجر، مراد انتہائی دُبلا جسم/ ڈھنڈھولیا = تونے ڈھونڈا، تونے کُریدا/ سگلا = سارا/ ماس = گوشت/ پر = پیارا، محبوب۔

اے کوّے! تُونے میرا جسم ہڈیوں تک کُرید ڈالا ہے اور سارا گوشت کھا لیا ہے۔ لیکن میری ان دو آنکھوں کو نہ چھُونا کیونکہ مجھے ابھی تک اپنے محبوب کے دیکھنے کی آس باقی ہے۔

معنی صاف ہیں، یعنی مرنے کے بعد بھی محبوب کے دیکھنے کی تمنا باقی ہے۔ اس مضمون کے شعر ابتدائی مغل عہد میں بعض ہندی شاعروں نے بھی کہے ہیں۔ عہد اکبری کا ایک شاعر رس خان کہتا ہے: کاگا رے تمہی بھلے، چُن چُن کھائیو ماس   دو نَیناں مت کھائیو مجھے پیا مِلن کی آس

ہو سکتا ہے کہ یہ شعر فرید ثانی کے ہوں جنھیں بابا نانک ملے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رس خاں نے بابا فرید سے مضمون چُرایا ہو۔

ਕਾਗਾ ਚੂੰਡਿ ਨ ਪਿੰਜਰਾ ਬਸੈ ਤ ਉਡਰਿ ਜਾਹਿ ॥
ਜਿਤੁ ਪਿੰਜਰੈ ਮੇਰਾ ਸਹੁ ਵਸੈ ਮਾਸੁ ਨ ਤਿਦੂ ਖਾਹਿ ॥੯੨॥

۹۲
کاگا چُونڈِ نَ پِنجرا بسَے ت اُڈرِ جاہِ
جتُ پِنجرے میرا سہُ وسَے ماسُ نَ تِدُو کھاہِ

چُونڈ = نوچ/ بسے تاں = بس ہے تو/ تِدوں = اُس سے۔

اے کوّے میرا پنجر نہ نوچ بلکہ تیرا بس چلے تو یہاں سے اُڑ جا (یعنی میرا لحاظ نہ سہی، کم از کم یہ تو سوچ کر) جو پنجر میرے محبوب کا گھر ہو اُس کا گوشت نہیں کھانا چاہیے (یعنی اسے ڈھانا نہیں چاہیے)۔

تعجب ہوتا ہے کہ ایسے کوّے کو، جو اتنا زور آور ہے کہ وہ جسم کا گوشت ہڈیوں تک کھا چکا ہے، یہ کہا جائے کہ "بس ہے تو...." ایسے کوّے کے بس نہ چلنے کا تو سوال ہی نہیں ہو سکتا؛ وہ تو مختارِ کُل نظر آتا ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਗੋਰ ਨਿਮਾਣੀ ਸਡੁ ਕਰੇ ਨਿਘਰਿਆ ਘਰਿ ਆਉ ॥
ਸਰਪਰ ਮੈਥੈ ਆਵਣਾ ਮਰਣਹੁ ਨਾ ਡਰਿਆਹੁ ॥੯੩॥

۹۳
فریدا گور نِمانی سڈُ کرے نِگھریا گھر آؤ
سر پرَ مَیتھَے آوَنا مرنہُ نَ ڈریاؤ

گور نمانی = بچاری قبر/ سڈ کرے = بُلائے، بُلاتی ہے/ نگھریا = اے بے گھرے!/ مَیتھے = میرے پاس/ سَرپَر = لازماً، یقیناً/ ڈریاؤ = ڈرو۔

(آدمی کو) اُس کی قبر آواز دے کر بُلاتی ہے کہ اے فلاں بے گھرے! اپنے گھر آؤ۔ جب آخر کار تمھیں میرے پاس ہی آنا ہے تو پھر مرنے سے ڈرتے کیوں ہو۔

مشہور ہے کہ آدمی کو اُس کی قبر دن میں تین مرتبہ پکار کر بُلاتی ہے۔ وہ اُسے نگھریا (اے بے گھرے!) کہہ کر خطاب کرتی ہے کیونکہ جو گھر اُس کا زمین کے اُوپر ہے وہ عارضی اور نہ ہونے کے برابر ہے، اس کا اصلی گھر قبر ہی ہے جہاں اسے ہمیشہ رہنا ہوگا۔ قبر کو نمانی (بے چاری) کہنا محل نظر ہے۔ قبر تو بے چاری نہیں ہوتی، وہ تو بڑوں بڑوں کو اپنے پاس کھینچ لاتی ہے۔

اس لیے بے چاری کہنے کی توجیہہ یہی باقی رہ جاتی ہے کہ قبر زمین کی سطح اور لوگوں کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے۔

ਇਨੀ ਲੋਇਣੀ ਦੇਖਦਿਆ ਕੇਤੀ ਚਲਿ ਗਈ ॥
ਫਰੀਦਾ ਲੋਕਾਂ ਆਪੋ ਆਪਣੀ ਮੈ ਆਪਣੀ ਪਈ ॥੯੪॥

۹۴
اِینی لوئِنیٔ دیکھدیا کیتی چلِ گئی
فریدا لوکاں آپو آپنیٔ مَے آپنیٔ پَئی

لوئنیں = لوَن سے، آنکھوں سے / کیتی = کِتنی، کتنی (خلقت)

اِنھی آنکھوں کے دیکھتے دیکھتے کِتنی ہی خلقت (موت کے مُنہ میں) چلی گئی۔ (لیکن اس کے باوجود لوگوں نے کوئی عبرت حاصل نہیں کی اور اِن) لوگوں کو اپنی اپنی ہی پڑی ہوئی ہے اور (انھیں کی طرح) مجھے بھی اپنی پڑی ہے۔

ہر آدمی اپنی مختصر زندگی میں اپنے ہزاروں جاننے والوں کو مرتا دیکھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ مرتے وقت اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے جاتے۔ اس لیے چاہیے تو یہ تھا کہ لوگ غیر ضروری مال اسباب اکٹھا کرنے سے باز رہتے۔ لیکن نہیں، وہ اپنی خود غرضیوں سے باز نہیں آتے اور ضرورت سے زیادہ مال اکٹھا کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ "میں آپنی پَی" یعنی مجھے اپنی پڑی ہے کا مطلب واضح نہیں ہے۔ شاید یہ کہنا مقصود ہو کہ لوگ اپنی راہ جا رہے ہیں اور میں اپنی راہ۔ یعنی وہ غمِ روزگار میں مُبتلا ہیں اور میں غمِ عشق میں۔

ਆਪੁ ਸਵਾਰਹਿ ਮੈ ਮਿਲਹਿ ਮੈ ਮਿਲਿਆ ਸੁਖੁ ਹੋਇ ॥
ਫਰੀਦਾ ਜੇ ਤੂ ਮੇਰਾ ਹੋਇ ਰਹਹਿ ਸਭੁ ਜਗੁ ਤੇਰਾ ਹੋਇ ॥੯੫॥

۹۵
آپُ سوارہِ مَے مِلہِ، مَے مِلیا سُکھُ ہوءِ
فریدا جے تُو میرا ہوءِ رہہِ سبھُ جگُ تیرا ہوءِ

مَیں مِلیں = میں مِلتا ہوں۔ میں ملوں گا۔

(اے انسان) اگر تو اپنے آپ کو سنوارے تو مَیں تجھے آملوں گا اور جب میں تجھے ملوں گا تو تجھے سُکھ ملے گا۔ اگر تو (دنیا سے کٹ کر) میرا ہو رہے تو دنیا تیری ہو جائے گی۔

خدا انسان کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ اگر تو اپنے آپ کو ٹھیک کرے تو مَیں (خدا) تجھے مِل جاؤں گا۔ اور اس سے ایک تو تجھے اطمینانِ قلب حاصل ہوگا، اور دوسرے (تو چاہے نہ چاہے) دنیا کے لوگ تیری ماننے لگیں گے۔ ہمارا آپ کا تجربہ اس بات کی تائید کرے گا کہ اگر کوئی واقعی خدا رسیدہ بے لوث شخص ہمارے درمیان آجائے تو وہ لوگوں کی محبت اور ادب و احترام کا مرکز بن جاتا ہے۔

اس شلوک میں یہ بات بڑی تعجب انگیز نظر آتی ہے کہ اس میں کلام کرنے والا خدا ہے جو اپنے آپ کو "میں" کہہ رہا ہے۔ تکلّم کا یہ انداز قرآن شریف اور احادیثِ قدسی میں اور کچھ اور الہامی کُتب میں تو ہے لیکن ان سے باہر ہم نے کم دیکھا تھا۔

ਕੰਧੀ ਉਤੇ ਰੁਖੜਾ ਕਿਚਰਕੁ ਬੰਨੈ ਧੀਰ ॥
ਫਰੀਦਾ ਕਚੈ ਭਾਂਡੈ ਰਖੀਐ ਕਿਚਰੁ ਤਾਈ ਨੀਰੁ ॥੯੬॥

۹۶
کنّدھی اُتےَ رُکھڑا کِچرکُ بنےَ دِھیر
فریدا کچےَ بھانڈےَ رکھیےَ کِچرُ تائی نِیر

کنڈھی = کنڈھے پر، کنارے پر / رُکھڑا = رُکھ کی تصغیر، مُراد رُکھ یا درخت / کِچرک = کتنا چر یا وقت / بنےَ = باندھے گا / دِھیر = دھیرج، مضبوطی سے / نِیر = پانی۔

کنارِ دریا پر کوئی درخت کب تک مضبوطی سے قدم جمائے رہے گا اور مٹی کے کچے برتن میں پانی کب تک جمع رہے گا۔

یہاں مُرورِ زمان یا وقت کے بے رُکے چلے چلنے کی دو مثالیں دی گئی ہیں۔ وقت دریا کے بہاؤ کی طرح ہے جو کناروں کو مسلسل ڈھاتا چلا جاتا ہے۔ کنارے پر کوئی درخت کتنی بھی مضبوطی سے جما ہو، وہ اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل جانے پر لازماً گر پڑتا ہے۔ اسی طرح مٹی کے کچے برتن سے پانی قطرہ قطرہ کر کے ضرور ٹپکے گا تا آنکہ برتن میں پانی ختم ہو جائے گا۔ درخت کا آخرکار اُکھڑ جانا اور کچے برتن کا آخرکار خالی ہو جانا انسانی موت کے لازماً آنے کی یاد دلاتے ہیں۔ زندگی کا وقت بھی لمحہ بہ لمحہ گزرتا چلا جاتا ہے اور آخرکار موت پر مُنتج ہوتا ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਮਹਲ ਨਿਸਖਣ ਰਹਿ ਗਏ ਵਾਸਾ ਆਇਆ ਤਲਿ ॥
ਗੋਰਾਂ ਸੇ ਨਿਮਾਣੀਆ ਬਹਸਨਿ ਰੂਹਾਂ ਮਲਿ ॥
ਆਖੀਂ ਸੇਖਾ ਬੰਦਗੀ ਚਲਣੁ ਅਜੁ ਕਿ ਕਲਿ ॥੯੭॥

۹۷
فریدا مَحل نِسکھنڑ رہِ گئے واسا آیا تَلِ
گوراں سے نِمانڑیا بہسنِ رُوحاں مَلِ
آکھیں سَیکھا بندگی چلنڑُ اجُ کہ کَلِ

نِسکھن = سکھنے، خالی۔ سکھن سے پہلے "ن" معنوں میں شدت لاتا ہے، یعنی بالکل خالی / واسا = بسنا، رہائش / تل = تلے، مُراد زمین کے تلے، قبریں / سے = وہ / مَل = جم کر بیٹھ جانا، ملّن مصدر سے / بندگی = سلام۔

(مکینوں کی موت سے) مکان خالی رہ گئے اور رہائش اُن کی زمین کے نیچے ہو گئی۔ یہ بیچاری رُوحیں اب قبروں میں بیٹھیں گی۔ اے شیخ (تو وہاں جا رہا ہے، ان قبر والوں کو) ہمارا سلام دینا اور کہنا کہ ہمارا آج کل میں یہاں سے چلنا ہو رہا ہے (یعنی ہم اب تم سے جلدی ملنے والے ہیں)۔

اس شلوک کا ترجمہ کچھ مشکلات سامنے لایا ہے۔ ایک مشکل یہ ہے کہ بعض مؤلفوں نے اس میں سے تیسرا مصرعہ ہی نکال دیا ہے۔ لیکن جب تک گرو گرنتھ اسے شلوک میں شامل رکھتا ہے ہم بھی اسے شامل ہی سمجھیں گے۔ پھر جنھوں نے تیسرا مصرعہ رہنے دیا ہے، انھوں نے "آکھیں شیخا بندگی" کا ترجمہ کیا ہے: "اے شیخ عبادت کیا کرو" جو ہمیں صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ہماری دانست میں "بندگی آکھیں" زبان کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں "سلام کہنا"۔ دوسرے مصرعے میں لفظوں کی ترتیب ذرا ٹیڑھی ہے۔ تاہم ہمارا خیال ہے کہ "نمانیاں بہسن رُوحاں" زبان کے محاورے کے مطابق "نمانیاں رُوحاں بہسن" کے معنی رکھتا ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਮਉਤੈ ਦਾ ਬੰਨਾ ਏਵੈ ਦਿਸੈ ਜਿਉ ਦਰੀਆਵੈ ਢਾਹਾ ॥
ਅਗੈ ਦੋਜਕੁ ਤਪਿਆ ਸੁਣੀਐ ਹੂਲ ਪਵੈ ਕਾਹਾਹਾ ॥
ਇਕਨਾ ਨੋ ਸਭ ਸੋਝੀ ਆਈ ਇਕਿ ਫਿਰਦੇ ਵੇਪਰਵਾਹਾ ॥
ਅਮਲ ਜਿ ਕੀਤਿਆ ਦੁਨੀ ਵਿਚਿ ਸੇ ਦਰਗਹ ਓਗਾਹਾ ॥੯੮॥

۹۸

فریدا مَوتے دا بنا ایوَے جِیو دریا وَے ڈھاہا
اگے دوجک تپیا سُنیئے ہُول پوَے کہاہا
اِکنا نو سبھ سوجھی آئی اِک پھردے ویپروا ہا
عمل جو کِیتیا دُنی وِچ سے درگہ اوگا ہا

بنا = اُبھرا ہوا کنارا / دریاوے = دریا کے / بنا = ایسا کنارا جو دریا کی کاٹ سے بنتا ہے اور سطح آب سے اُونچا ہوتا ہے / ہُول = چاروں کھُونٹ کا شور / کہاہا = ہاہا کار، شورِ فریاد / سُوجھی = سوجھ بوجھ، سمجھ / ویپرواہا = بے پرواہ / سے = وہ / درگاہ = خدا کی درگاہ / اوگاہا = گواہ -

مَوت کی سرحد ایسی ہے جیسے دریا کا اونچا کنارا ہوتا ہے۔ سنتے ہیں کہ (اس سرحد کے) آگے دوزخ تپ رہا ہے اور چاروں طرف ہاہا کار کا شور اُٹھ رہا ہے۔ اس پر بھی ایک وہ لوگ ہیں جو بے پرواہ پھرتے ہیں، لیکن ایک وہ ہیں جو (عمل اور جزا کی) بات سمجھ گئے ہیں۔ جب کوئی (سرحدِ موت کے دوسری طرف) درگاہِ خداوندی میں پیش ہوتا ہے تو اس کے کیے ہوئے عمل خود اس کے خلاف (یا حق میں) گواہی دیتے ہیں -

جہنم کا دریا کے دوسری طرف واقع ہونا اسلامی روایت نہیں بلکہ یونانی روایت ہے۔ یونانی دیو مالا میں شائکس (Styx) ملاح دوزخیوں کی رُوحیں دریا کے پار لے جا کر دوزخ سپرد کرتا ہے۔ عملوں کا خود گواہی دینا سورہ یٰسین کے اُس فرمان سے لیا گیا ہے جس میں آتا ہے کہ حساب کتاب کے دن گُنہ گار خواہ مُنہ سے کچھ کہیں اُن کے ہاتھ پاؤں خود گناہوں کا اقرار کریں گے۔

ਫਰੀਦਾ ਦਰੀਆਵੈ ਕੰਨੈ ਬਗੁਲਾ ਬੈਠਾ ਕੇਲ ਕਰੇ ॥
ਕੇਲ ਕਰੇਦੇ ਹੰਝ ਨੋ ਅਚਿੰਤੇ ਬਾਜ ਪਏ ॥
ਬਾਜ ਪਏ ਤਿਸੁ ਰਬ ਦੇ ਕੇਲਾਂ ਵਿਸਰੀਆਂ ॥
ਜੋ ਮਨਿ ਚਿਤਿ ਨ ਚੇਤੇ ਸਨਿ ਸੋ ਗਾਲੀ ਰਬ ਕੀਆਂ ॥੯੯॥

۹۹

فریدا دریاوَے کنّے بگُلا بیٹھا کیل کرے
کیل کریدے ہنجھ نو اچِنتے باز پئے
باز پئے تِسُ رب دے کیلاں وِسریاں
جو مَنِ چِتِ نَ چیتے سنِ سو گالی رب کیاں

دریاوے = دریا کے / کنّے = کنارے / بگلا = ایک سفید لم ٹنگا پرندہ جو چھپڑوں میں مچھلی کا شکار کر کے کھاتا ہے اور ظاہری شکل صورت میں ہنس سے مشابہ ہوتا ہے۔ "بگلا بھگت"

منافق آدمی کو کہا جاتا ہے۔/ کیل = کھیل، کُیل / ہنجھ = ہنس۔ یہاں ہنس سے مُراد وہی بگلا ہے جو پہلے مصرعے میں مذکور ہوا ہے، لیکن سمجھ نہیں آتا کہ یہاں بگلے کو ہنس کیوں کہا گیا ہے/ اچنچے = اچانک، بے خبری میں/ باج = باز، جو یہاں مَلک الموت کی علامت ہے/ کیلاں وسریاں = کھیلیں بھُول گئیں۔/ جو من چیت نہ چیت = جو من کے خیال میں نہ تھیں(؟)/ گالیں = باتیں، کام۔

دریا کے کنارے پر بگلا (سب کچھ بھُلائے) کھیل کُیل کر رہا ہے۔ اِس ہنس نُما بگلے کو اچانک باز آ پڑتا ہے۔ یہ باز خدا کی طرف سے آیا ہے اور اس سے (بگلے کو) سب کھیلیں بھُول جاتی ہیں۔ خدا ایسے کام کرتا ہے جو کسی کے خیال میں بھی نہیں ہوتے۔

اس شلوک میں غافل اور عیش و عشرت میں مست انسان کو ایسے بگلے سے تشبیہ دی گئی ہے جو دریا کے کنارے پر مچھلیوں کا شکار کھیل رہا ہے اور جو یکایک خود باز کا شکار ہو جاتا ہے۔ عیش مست غافل انسان کو بھی اچانک مَوت آن لیتی ہے۔ حالانکہ اسے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ مَوت اسے یوُں آئے گی۔ ماننا پڑتا ہے کہ خدا کبھی ایسے کام بھی کرتا ہے جس کی بندے کو توقع نہیں ہوتی۔

شلوک کی تشریح میں کچھ مشکلات درپیش آتی ہیں۔ نہیں معلوم کہ دوسرے مصرعے میں بگلے کو ہنجھ کیوں کہا گیا؛ تیسرے مصرعے میں باز جمع کے صیغے میں کیوں آیا ہے؟ کیا ایک بگلے کے شکار کے لیے کئی باز آگئے تھے؟؛ اور "من چیت نہ چیت" کی ترکیب از رُوئے نحو کس طرح جائز ہوگی؟ کیا یہ کوئی متروک محاورہ ہے؟

ਸਾਢੇ ਤ੍ਰੈ ਮਣ ਦੇਹੁਰੀ ਚਲੈ ਪਾਣੀ ਅੰਨਿ ॥
ਆਇਓ ਬੰਦਾ ਦੁਨੀ ਵਿਚਿ ਵਤਿ ਆਸੂਣੀ ਬੰਨ੍ਹਿ ॥
ਮਲਕਲਮਉਤ ਜਾਂ ਆਵਸੀ ਸਭ ਦਰਵਾਜੇ ਭੰਨਿ ॥
ਤਿਨਾ ਪਿਆਰਿਆ ਭਾਈਆਂ ਅਗੈ ਦਿਤਾ ਬੰਨ੍ਹਿ ॥
ਵੇਖਹੁ ਬੰਦਾ ਚਲਿਆ ਚਹੁ ਜਣਿਆ ਦੈ ਕੰਨ੍ਹਿ ॥
ਫਰੀਦਾ ਅਮਲ ਜਿ ਕੀਤੇ ਦੁਨੀ ਵਿਚਿ ਦਰਗਹ ਆਏ ਕੰਮਿ ॥੧੦੦॥

۱۰۰
ساڈھے ترَے منْ دیہُری چلےَ پانیْ اَنِ
آیو بنّدا دُنی وِچ وتِ آسُونْ بنّھِ
ملکُ المَوت جاں آوسیَ سبھ درواجے بھنِ
تِنا پیاریا بھائِیاں اگےَ دِتا بنّھِ
دیکھُ بنّدا چلیا چہُ جنْیا دے کنّھِ
فریدا عمل جِ کِیتے دُنی وِچِ درگہِ آئے کِمِ

دیہری = دیہہ، جسم/ اَن = اناج/ وَتّ = وتن مصدر سے، چلا پھرتا ہے/ آسونی بنھ = آسیں اُمیدیں باندھے/ جاں = جب/ تِنہاں = اُن/ اگےّ = سامنے، پہلے/ کنھ = کندھوں پر/ "ساڈھے ترے من دیہری" ساڑھے تین من آجکل کے اوسط انسانی وزن سے بہت زیادہ لگتا ہے۔ یا تو فرید کے زمانے میں آدمیوں کا وزن زیادہ ہوتا تھا یا من چھوٹا ہوتا تھا؛ غالباً آخری صُورت تھی۔

یہ ساڑھے تین من کا انسانی بدن اناج اور پانی کے سہارے چلتا ہے (زندہ ہے)۔ آدمی دنیا میں آیا ہے اور آسیں اُمیدیں باندھے چلا پھرتا ہے۔ لیکن (اس کی جان قبض کرنے) مَلکُ الموت اس کے محل کے سب دروازے (یا اُس کے اعضائے جسم کی سب مزاحمتیں) توڑتا ہوا آ پہنچے گا، اور اُس کے اپنے ہی پیارے بھائی اسے سب کے آگے (کفن میں) باندھ

دیں گے۔ (اے لوگو بنگاہِ عبرت) دیکھو کہ اس انسان کی میت (جو پہلے امیدیں باندھے چلا پھرتا تھا) اب چار آدمیوں کے کندھے پر ساکت چلی جارہی ہے۔ (اگلے جہان میں اس کا کوئی وسیلہ نہیں) صرف وہ نیک عمل جو اُس نے دنیاوی زندگی میں کیے تھے درگاہِ خداوندی میں اس کے کام آئیں گے۔

یہ شلوک بہت اثر انگیز ہے۔ انسان کی اُمیدوں بھری زندگی جس کا ذکر پہلے دو مصرعوں میں ہے۔ باوجود سب حفاظتوں حصاروں کے موت کو نہیں روک سکتی۔ تیسرا مصرع "ملک الموت جد آوسی سبھ دروجے بھن" صوتی اعتبار سے بے مثل ہے۔ ملک الموت کی زور آور یلغار کے آگے انسانی حصار کے دروازے ٹوٹنے کی آوازیں سچ مچ سنائی دینے لگتی ہیں۔ پھر "دیکھو بندا چلیا" کی نرم اصوات ایک کنٹراسٹ پیدا کرکے اثر کو اور بڑھا دیتی ہیں۔ تیسرے مصرعے میں مشدد "بھن" کو بطور قافیہ استعمال کرنے سے اثر کئی گنا بڑھ گیا ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਹਉ ਬਲਿਹਾਰੀ ਤਿਨ੍ ਪੰਖੀਆ ਜੰਗਲਿ ਜਿਨ੍ਾ ਵਾਸੁ ॥
ਕਕਰੁ ਚੁਗਨਿ ਥਲਿ ਵਸਨਿ ਰਬ ਨ ਛੋਡਨਿ ਪਾਸੁ ॥੧੦੧॥ ۱۰۱

فریدا ہَو بَلہاری تِنہ پنکھیا جنگلِ جنا واسُ
ککرُ چُگنِ تھلِ وسنِ رب نَ چھوڈنِ پاسُ

ہَوں = مَیں / بلہاری = واری، صدقے، قربان / واس = بسنا، بسیرا / ککر = کنکر۔ بعض پرندے اناج کے دانوں کے علاوہ کنکر بھی چگ لیتے ہیں، لیکن واضح ہو کہ کنکر اُن کی غذا نہیں ہوتے۔ کنکر پوٹے اور معدے میں جمع شدہ اناج کے سخت دانوں کو اپنی رگڑ سے توڑتے پھوڑتے ہیں اور ایک حد تک دانتوں کے نہ ہونے کا بدل بن جاتے ہیں / تھل = ریگستان / پاس = پاسا، نزدیکی، آسرا۔

میں اُن پنکھیوں پر قربان جاؤں جو جنگلوں ہی میں گزر بسر کرتے ہیں۔ وہ بنجر ریگستانوں میں رہتے ہیں اور کھانے کو دانہ دُنکا نہ ملے تو کنکر چگ کر گزارہ کر لیتے ہیں اور خدا کا آسرا نہیں چھوڑتے۔ پرندوں کے خوراک نہ جمع کرنے کی جبلت اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں۔ انجیلِ مقدس میں بھی ان کا ذکر انسانوں کے لیے مثال کے طور پر آیا ہے؛ یعنی اگر انسان اپنے خدا پر پورا بھروسا کرے اور مال اندوزی نہ کرے تو پرندوں کی طرح اسے بھی خدا رزق پہنچائے گا۔ بابا فرید کا مقصد بھی انسانوں کو قناعت ہی کی تلقین کرنا ہے، لیکن وہ یہ سامنے کی مثال دیتے ہیں کہ جب پرندوں کو اناج نہیں ملتا تو وہ کنکر کھا لیتے ہیں جو ہر جگہ مل جاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ بابا فرید نے بھوک کے شدید اضطرار میں کنکر اٹھا کر منہ میں ڈال لیے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ شلوک اسی تجربے کے باقیات میں سے ہو۔

ਫਰੀਦਾ ਰੁਤਿ ਫਿਰੀ, ਵਣੁ ਕੰਬਿਆ, ਪਤ ਝੜੇ ਝੜਿ ਪਾਹਿ ॥
ਚਾਰੇ ਕੁੰਡਾ ਢੂੰਢੀਆਂ ਰਹਣੁ ਕਿਥਾਊ ਨਾਹਿ ॥੧੦੨॥ ۱۰۲

فریدا رُتِ پھری ونُ کنبّیا پت جھڑے جھڑِ پاہِ
چارے کُنڈا ڈھونڈِھیاں رہنُ کِتھاؤُ ناہِ

رُت = موسم / وَن = جنگل، مُراد جنگل کے درخت ہیں کیونکہ کانپنے کا فعل جنگل سے نہیں بلکہ درختوں ہی سے منسوب کیا جا سکتا ہے / پت جھڑے جھڑ پاہ = لغوی معنی صاف نہیں۔ شاید محاورہ ہے جس کا مطلب "پتے جھڑ جھڑ پڑے" ہو سکتا ہے / چارے کُنڈاں = چاروں کھونٹ، ہر طرف / رہن = دو معنی ہو سکتے ہیں: (۱) رہنا، جائے سکونت (۲) باقی رہنا، بقا۔

موسم بدلا، جنگل (کے درخت تیز ہواؤں میں) جھومے، اور اُن سے پتے جھڑ جھڑ پڑے۔ (میں نے) چاروں طرف ڈھونڈا لیکن (۱) (امان کی) جگہ کہیں نہ ملی / (۲) بقا کہیں نہ پائی۔

سبھی شارحین نے " رُت پھری" یعنی موسم بدلنے سے مُراد جوانی کا جانا اور بڑھاپے کا آنا لیا ہے۔ اسی لحاظ سے " ون کنّبیا " سے مُراد بدن میں رعشہ پڑنا اور " ڈہن کتھاوں نا ہیں" کا مطلب کسی کروٹ آرام نہ پانا لیا ہے۔

یہ تشریح نامناسب تو نہیں لیکن ہمارے شارحین سے یہ بات اوجھل رہی ہے کہ ایک حساس آدمی، جو فرید یقیناً تھے، اپنے ماحول کی موسمی تبدیلیوں سے گہرا جذباتی تعلق رکھتا ہے جو اسے کبھی مہربان اور کبھی بے مہر معلوم ہونے لگتی ہیں فرید کا جماعت خانہ ایک بے آباد علاقے میں واقع تھا جہاں اس " جنگل جنگل گھومنے والے (شلوک ۱۹) درویش پر پڑنے والے موسمی اثرات کو " ٹوٹے چھپر" کی چھت (شلوک ۱۸) اور کمبلی کی اوٹ (شلوک ۲۴) اچھی طرح روک نہ سکتی تھیں۔

فرید یقیناً تغیرِ زمان سے بہت متاثر تھے اور اس سے اخلاقی سبق بھی اخذ کرتے تھے، لیکن جو جذباتی تعلق اُن کا اپنے گرد و پیش کے دریاؤں، جنگلوں اور موسموں کے سرد و گرم سے تھا وہ بھی بڑا گہرا تھا اور اس کا اظہار انہوں نے جگہ جگہ کیا ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਪਾੜਿ ਪਟੋਲਾ ਧਜ ਕਰੀ ਕੰਬਲੜੀ ਪਹਿਰੇਉ ॥
ਜਿਨ੍ਹੀ ਵੇਸੀ ਸਹੁ ਮਿਲੈ ਸੇਈ ਵੇਸ ਕਰੇਉ ॥੧੦੩॥

۱۰۳
فریدا پاڑ پٹولا دھج کری کنبلڑی پھریو
جنی ویسی سہ ملے سیئ ویس کریو

پاڑ = پھاڑ / پٹولا = پٹ یعنی ریشم کا لباس / دھج کری = دھجیاں کر دے / پھریُو = پہن / جنھی ویسیں = جس بھیس کرنے سے ؛ جس لباس پہننے سے۔
ریشم کا لباس پھاڑ کر اُس کی دھجیاں کر دے اور اس کی بجائے کمبلی پہن لے۔ جس بھیس کرنے سے محبوب ملے وہی بھیس کرے۔
مقصودِ عاشق نہ ریشمی لباس ہے نہ کمبلی۔ اُس کا مقصود تو رضائے محبوب ہے۔ لہذا اگر محبوب اسے کمبلی پہنے دیکھنا چاہتا ہے تو پھر اسے کمبلی پہننی چاہیے اور اگر ریشم تو ریشم۔

ਕਾਇ ਪਟੋਲਾ ਪਾੜਤੀ ਕੰਬਲੜੀ ਪਹਿਰੇਇ ॥
ਨਾਨਕ ਘਰ ਹੀ ਬੈਠਿਆ ਸਹੁ ਮਿਲੈ
ਜੇ ਨੀਅਤਿ ਰਾਸਿ ਕਰੇਇ ॥੧੦੪॥

۱۰۴
کاءِ پٹولا پاڑت کنبلڑی پہرےءِ
نانک گھر ہی بیٹھا سہ ملے
جے نیئتِ راسِ کرےءِ (گرُو امرداس)

کاءِ = کاہے، کِس لیے / راس = شاید فارسی لفظ "راست" کی پنجابی شکل ہے۔ معنی ہیں سچا یا سیدھا۔

کِس لیے ریشمی لباس پھاڑتا ہے اور کمبلی پہنتا ہے۔
اے نانک گھر میں بیٹھے ہی تجھے اپنا محبوب ملے گا
بشرطیکہ تو اپنی نیت کو سچا رکھے۔

یہ شلوک فرید کا نہیں بلکہ گرو امرداس کا ہے جو فرید کے پچھلے شلوک کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ گرو امرداس نے بات تو وہی کی ہے جو فرید نے کہی تھی لیکن یہاں لہجہ نرم ہے۔
خیال رہے کہ سِکھ گرُو شعر میں اپنا تخلص نانک بھی کرتے تھے۔

ਫਰੀਦਾ ਗਰਬੁ ਜਿਨਾ ਵਡਿਆਈਆ ਧਨਿ ਜੋਬਨਿ ਆਗਾਹ ॥
ਖਾਲੀ ਚਲੇ ਧਣੀ ਸਿਉ ਟਿਬੇ ਜਿਉ ਮੀਹਾਹੁ ॥੧੦੫॥

۱۰۵

فریدا گربُ جِنہا وڈیائِیا دھنِ جوبنِ آگاہُ
خالی چلے دھنی سیو ٹِبے جیو میہاہُ

گرب = ہنکار، گھمنڈ / آگاہ = زیادہ / وڈیائیاں = بڑائیاں / دھنی = مالک، خدا / ٹبّہ = ٹیلا۔

وہ جنھیں اپنی بڑائی، مال، حسن اور جوانی کے زیادہ ہونے پر گھمنڈ ہے، وہ خداشناسی سے اس طرح خالی رہتے ہیں جس طرح کوئی ٹیلہ مینہ کے بعد خشک رہ جاتا ہے۔

دنیاوی اسباب کی فراوانی کا غرور (ایک ایسا پردہ ہے جو) آدمی کو خدا کی معرفت سے پرے رکھتا ہے۔ ایسے آدمی کو جو اپنی اُونچی حیثیت پر مغرور ہے، اس شلوک میں ٹیلے سے تشبیہ دی گئی ہے، جو اس لیے بہت موزوں ہے کہ ایسا آدمی اور ٹیلا دونوں اپنی اونچائی کے باعث حقیقی نفع سے محروم رہتے ہیں۔ زمین کی بڑی صفت بارش کے پانی سے فائدہ اٹھانا ہے، لیکن ٹیلے کی زمین چونکہ اونچی ہوتی ہے اُس پر پانی ٹھہرتا ہی نہیں اور وہ بارش سے کچھ حاصل نہیں کر پاتی۔ ایسے ہی اُونچی گردن والا مغرور انسان بھی خدا سے اپنا رشتۂ بندگی قائم نہیں کر پاتا اور دنیا سے محروم جاتا ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਤਿਨਾ ਮੁਖ ਡਰਾਵਣੇ ਜਿਨਾ ਵਿਸਾਰਿਓਨੁ ਨਾਉ ॥
ਐਥੈ ਦੁਖ ਘਣੇਰਿਆ ਅਗੈ ਠਉਰ ਨ ਠਾਉ ॥੧੦੬॥

۱۰۶

فریدا تِنا مُکھ ڈراونُے جِنا وِسارِیونُ ناؤ
اَیتھےَ دُکھ گھنیریا اگےَ ٹھور نَ ٹھاؤ

تِنھاں = اُن کے / مُکھ ڈراونے = جن چہروں سے ڈر یا نفرت پیدا ہو / وساریو = بھلا دیا / ناؤں = نامِ اللہ کا نام، ذکر اللہ / گھنیرے = گھنے، بہت / ٹھور = ٹھہر، ٹھکانہ / ٹھاؤں = تھاؤں، ٹھکانہ۔

جن لوگوں نے اللہ کا نام بھلا دیا، اُن کے چہرے (مسخ ہو کر) ڈراونے ہو گئے۔ اس جہان میں بھی اُن کو بہت دُکھ ہیں اور اگلے جہان میں بھی انھیں (پناہ کے لیے) کوئی ٹھکانہ نہیں ملے گا۔

اللہ کو یاد رکھنے اور کثرت سے ذکر اللہ کرنے سے دل مطمئن ہوتا ہے ("سن رکھو، یاد الٰہی سے دِل اطمینان پاتے ہیں"۔ قرآن) اور جب دِل مطمئن ہوتا ہے تو اس کا اثر چہرے پر ظاہر ہوتا ہے اور لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ لیکن خدا کو بھلا دینے والوں اور شیطانی کاموں میں مشغول رہنے والوں کے چہرے ایسے ہو جاتے ہیں کہ کوئی انھیں دیکھنا پسند نہیں کرتا اور اُن سے پرے رہنے میں عافیت سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کی یہ نفرت ان شیطان کے چیلوں کے لیے (وہ کتنا ہی جاہ و حشم رکھتے ہوں) دُکھ کا باعث ہوتی ہے۔ اور اگلا جہاں تو ہے ہی الٰہی قدروں کا (آج دُنیا اللہ کی دُنیا ہے۔ قرآن) وہاں بھلا اُن کا کیا مقام۔

ਫਰੀਦਾ ਪਿਛਲ ਰਾਤਿ ਨ ਜਾਗਿਓਹਿ ਜੀਵਦੜੋ ਮੁਇਓਹਿ ॥
ਜੇ ਤੈ ਰਬੁ ਵਿਸਾਰਿਆ ਤ ਰਬਿ ਨ ਵਿਸਾਰਿਓਹਿ ॥੧੦੭॥

۱۰۷
فریدا پِچھل راتِ نَ جاگیوہِ جِیوَدڑو مُیُوہِ
جے تَے ربُ وِساریا تَ ربِ نَ وِسریوہِ

پِچھل رات = پچھلی رات، رات کا پچھلا پہر/ جیوَندڑو = جیتے جی/ تیں = تُونے/ تاں = تجھ کو۔ تاں کے حالتِ مفعولی میں استعمال کی کوئی سند نہیں ملی۔
تُو پچھلی رات نہیں جاگا (اور عبادت نہیں کی) تو جان کہ تُو جیتے جی ہی مر گیا ہے۔ اگرچہ تُونے رب کو بُھلا دیا ہے لیکن (یاد رکھ) رب نے تجھے نہیں بھلایا۔
فرید کہتے ہیں، اور کئی صُوفی اُن کے ہمنوا ہوں گے، کہ شب زندہ دار لوگ ہی حقیقت میں زندہ ہیں۔ ان کے برعکس تمام رات غافل سونے والے گویا مُردہ ہیں۔ یہ پہلے مصرعے کا مضمون ہے اور اس میں جس نااُمیدی کا اظہار ہوا ہے (جِیوَندڑو مویوں) وہ قطعی لگتی ہے۔ لیکن دوسرے مصرعے میں اُمید کی ایک جھلک پھر دکھائی دیتی ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی چاہے خدا سے غافل ہو لیکن خدا اس کی بہبُود سے غافل نہیں اور اسے حقیقی زندگی کی طرف لَوٹانا اسے نہیں بھُولا اور وہ اسے کبھی نہ کبھی اس کا موقع دے گا۔

ਫਰੀਦਾ ਕੰਤੁ ਰੰਗਾਵਲਾ ਵਡਾ ਵੇਮੁਹਤਾਜ ॥
ਅਲਹ ਸੇਤੀ ਰਤਿਆ ਏਹੁ ਸਚਾਵਾ ਸਾਜੁ ॥੧੦੮॥

۱۰۸
فریدا کنتُ رنگاولا وڈا ویمحتاج
الہ سیتی رتیا ایہُ سچاوا ساج (گُرو ارجن دیو)

کنت = مالک، خدا، خاوند/ رنگاولا = کثیرِ رنگ/ بے محتاج = جو کسی کا محتاج نہ ہو۔ بے نیاز۔ "بے محتاج" کی ترکیب عجیب سی ہے۔ ہم نے کسی اور پنجابی تحریر میں یہ ترکیب نہیں دیکھی/ سیتی = سے/ سچاوا = سچا، حقیقی/ ساج = اسم ہے جو غالباً "سجنا" مصدر سے حاصل ہوا ہے۔ رُوپ۔
اے فرید! رب کے بہت رنگ ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ جو اللہ کے رنگ میں رنگا گیا اسی کا رُوپ سچا رُوپ ہے۔
یہ اور اگلے تین شلوک گرو ارجن دیو کے ہیں جو سکھوں کے پانچویں گُرو تھے اور جنھوں نے اکبری عہد میں گرنتھ صاحب کی تدوین کی تھی۔ اس شلوک میں خدا کی جو صفت "رنگاولا" بیان ہوئی ہے اس کے دو معنی سمجھے جا سکتے ہیں۔ بعض شارحین نے اس کے معنی کیے ہیں: "خدا رنگین مزاج ہے" (کرشن جی کو جو خدا کے اوتار مانے جاتے ہیں، اِس کی مثال سمجھیے)۔
دوسرے معنی جو گرو ارجن کے شلوک (۷۵) "خالق خلق میں ...." سے ظاہر ہوتے ہیں یہ ہیں کہ خدا کا ظہور رنگا رنگ مخلوق میں ہوتا ہے (اگرچہ وہ اصلاً واحد ہے)۔
یہ بات قابلِ غور ہے کہ گرو ارجن دیو کا مزاج رنگوں سے بہت متاثر دکھائی دیتا ہے۔ ان کے کئی شلوک اس کے گواہ ہیں۔ شلوک (۸۲) میں وہ "جھُوم رنگاولی" اور شلوک (۸۳) میں "سُو تڑی دیہہ" کا حوالہ دیتے ہیں اور یہاں ۱۰۸ میں "کنت رنگاولا" کا ذکر آ گیا ہے۔ قرآن شریف میں بھی "صِبْغَۃَ اللّٰہ" (اللہ کا رنگ) مذکور ہوا ہے، لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ یہ صرف اندازِ بیان ہے؛ خدا ایک غیر مرئی حقیقت ہے جو رنگ نہیں رکھتی۔

ਫਰੀਦਾ ਦੁਖੁ ਸੁਖੁ ਇਕੁ ਕਰਿ ਦਿਲ ਤੇ ਲਾਹਿ ਵਿਕਾਰੁ ॥
ਅਲਹ ਭਾਵੈ ਸੋ ਭਲਾ ਤਾਂ ਲਭੀ ਦਰਬਾਰੁ ॥੧੦੯॥

۱۰۹

فریدا دکھ سکھ اک کر دل تے لاہ وکار
اللہ بھاوے سو بھلا تاں لبھی دربار (گرو ارجن دیو)

اِک کر = ایک سمجھ / تے = تو۔ تے بمعنی تو مغربی پنجاب میں مستعمل نہیں۔ "تے" کا استعمال گرو ارجن دیو کے کلام پر مشرقی پنجاب کی بولی کا اثر ظاہر کرتا ہے / وکار = بگاڑ، گناہ / بھاوے = پسند کرے۔

اے فرید دُکھ اور سُکھ کو ایک جیسا سمجھ، اور دل سے گناہوں کو دُور کر۔ اچھا وہی ہے جو اللہ کو اچھا لگے۔ تب تیری رسائی دربار تک ہوگی۔

دونوں مصرعوں کا آپس میں ربط سمجھ نہیں آتا اور ہر مصرعے کا اندرونی ربط بھی کمزور لگتا ہے۔ دل سے گناہ دُور کرنے سے دُکھ سُکھ کے ایک سمجھنے میں کوئی بڑی مدد نہیں ملتی؛ پہلی بات اخلاق سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری فلسفیانہ فکر سے۔ پھر "اللہ بھاوے سو بھلا" کا جملہ گرامر کے اعتبار سے کوئی امر یا شرط نہیں کہ "دربار تک کی رسائی" اس کی جزا کہی جائے۔ وہ محض ایک بیان ہے اور از رُوئے نحو کسی جزا کا طالب نہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دُکھ سُکھ، وکار اور بھلائی الگ الگ چیزیں ہیں جو اپنی اپنی جگہ بہت اچھی ہیں اور شاعر نے انہیں کسی علت معلول جیسے سلسلے میں جوڑنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ پھر بھی "تاں" کا لفظ جملوں کو جوڑنے والا عطف ہے اور اس کی موجودگی ایک مسئلہ ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਦੁਨੀ ਵਜਾਈ ਵਜਦੀ ਤੂੰ ਭੀ ਵਜਹਿ ਨਾਲਿ ॥
ਸੋਈ ਜੀਉ ਨ ਵਜਦਾ ਜਿਸੁ ਅਲਹੁ ਕਰਦਾ ਸਾਰ ॥੧੧੦॥

۱۱۰

فریدا دُنی وجائی وجدی تُوں بھی وَجہِ نالِ
سوای جیو نَ وجدا جِسُ اللہُ کردا سار (گرو ارجن دیو)

دُنی = دُنیا، دنیادار لوگ / وَجائی وجدی = بجانے سے بجتی ہے؛ نچانے سے ناچتی ہے / وَجہِ = بجتے ہو، ناچتے ہو / وجدا = بجتا، ناچتا / سار = حفاظت، سنبھال۔

اے فرید! دنیادار لوگ (نغماتِ شیطان کے سُر تال سے) ہمنوا (یا ہم رقص) ہیں اور تو بھی اُن کے ساتھ ہمنوا (یا ہم رقص) ہے۔ صرف وہ انسان (شیطان کا) ہمنوا نہیں بنتا جس کی اللہ خود حفاظت کرتا ہے۔

گرو ارجن دیو کے اس شلوک کا سمجھنا مشکل ہے۔ اگر یہ شلوک فرید کا اپنا ہوتا تو جیسا کہ کسرِ نفسی کی روایت اور طریق ہے، اُن کا اپنے آپ کو ملامت کر لینا سمجھ آ سکتا تھا۔ لیکن ایک شخص (ارجن) اپنے مرشد (نانک) کے نہایت محترم ممدُوح (فریدؒ) کو یہ کہے کہ جس طرح دنیادار دنیاوی مقاصد کے لیے کٹھ پتلی کی طرح ہمنوا اور ہم رقص ہیں تم بھی گا ناچ رہے ہو، کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ دیکھتے ہوئے فریدا کا لفظ وزن سے باہر ہے اور مصرع اس کے باہر نکال دینے سے موزوں ہو جاتا ہے، غالباً گرو ارجن دیو نے فرید کو مخاطب ہی نہیں کیا ہوگا۔ کتابت کرنے والوں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ سب شلوک فرید کے تعلق سے کہے گئے ہیں یہاں "فریدا" کا لفظ ڈال دیا ہوگا جیسا کہ اور بہت سی جگہوں پر ڈالا گیا ہے۔

بہرحال شلوک کا مطلب صاف ہے، یعنی یہ کہ آدمی محض اپنے بل بوتے اور فہم و فکر سے شیطانی ترغیبوں اور وسوسوں سے نہیں بچ سکتا، بلکہ خدا کی توفیق بھی شاملِ حال ہو تو ایسا ہو سکتا ہے۔

ਫਰੀਦਾ ਦਿਲੁ ਰਤਾ ਇਸੁ ਦੁਨੀ ਸਿਉ ਦੁਨੀ ਨ ਕਿਤੈ ਕੰਮਿ ॥
ਮਿਸਲ ਫਕੀਰਾਂ ਗਾਖੜੀ ਸੁ ਪਾਈਐ ਪੂਰ ਕਰੰਮਿ ॥੧੧੧॥

111

فریدا دِلُ رتا اِسُ دُنی سیو دُنی نَ کِتےَ کمِ
مثل فقیراں گاکھڑی سُ پائیےَ پُور کرمِ
(گرو ارجن)

دِل رتا = دل رنگا ہے / نہ کِتے کم = کسی کام کا نہیں / مِثل فقیراں = فقیروں کی طرح، فقیروں کا طریق / گاکھڑی = مشکل / سو پائیےَ = وہ پاتا ہے (؟) / پُور کرم = پوری قسمت، اچھی قسمت۔

دل رنگا ہے اس دُنیا سے اور دنیا کسی کام کی (شے) نہیں۔ فقیروں کا طریق مشکل (بھی) ہے اور اچھی قسمت سے ہی ملتا ہے۔
مصرعوں کا تعلق کچھ مبہم ہے۔ پہلے مصرعے میں مخاطب سے کہا گیا ہے کہ تیرا دل اس دنیا کی رنگینیوں اور معاملوں میں اُلجھا ہوا ہے لیکن دنیا درحقیقت ایک بے کار شے ہے اور دل لگانے کے قابل نہیں۔ پھر اگر دنیا بے کار شے ہے تو کارآمد شے کونسی ہے؟ جواب میں کہا جارہا ہے کہ اگر کسی کی قسمت اچھی ہے تو اسے فقیری کا طریق مل جاتا ہے، اگرچہ فقیری طریق پر چلنا بہت مشکل ہے۔
پتے جنھاں دے پئی فقیری بھاگ تنہاں دے چنگے (شاہ حسین)

ਪਹਿਲੈ ਪਹਰੈ ਫੁਲੜਾ ਫਲੁ ਭੀ ਪਛਾ ਰਾਤਿ ॥
ਜੋ ਜਾਗੰਨਿ ਲਹੰਨਿ ਸੇ ਸਾਈ ਕੰਨੋ ਦਾਤਿ ॥੧੧੨॥

112

پہلے پہرے پھُلڑا پھل بھی پچھا رات
جو جاگن لہن سے سائی کنو دات

پہلے پہرے = رات کے پہلے پہر میں / پچھا رات = رات کے پچھلے پہر میں / لہن سے = سے لہن، وہ لیں گے / کنوں = سے، غالباً پنجابی لفظ 'کولوں' کی دوسری شکل ہے / دات = داد، بخشش۔

(عبادت رات کے) پہلے پہر میں پھول ہوتی ہے لیکن پچھلے پہر میں وہ پھل بھی ہو جاتی ہے۔ جو (عبادت گزار) اس پہرے میں جاگتے رہتے ہیں وہ خدا سے بخشش (انعام) پاتے ہیں۔

اس شلوک میں رات کے آخری حصے کی خاموشی اور سکون اور عبادت کی کیفیت کے گہرے ہو جانے کا بیان ہے۔ جب شب زندہ دار بندے رات کے پہلے پہرے گزر کر، جہاں انھیں احساس یہ ہوتا ہے کہ ہم خدا کے سامنے حاضر ہیں اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہے، رات کے آخری پہر میں پہنچتے ہیں تو اُن کا یہ احساس نہ صرف بڑھ جاتا ہے بلکہ انہیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ خدا ہماری دعائیں سُن بھی رہا ہے اور قبول کر رہا ہے۔ یعنی ابتدائے شب میں جو کیفیت پھُول تھی اب پھل بن گئی ہے۔

اقبال کہتا ہے:

افلاک سے آتے ہیں نالوں کے جواب آخر
اُٹھتے ہیں حجاب آخر، کرتے ہیں خطاب آخر

ਦਾਤੀ ਸਾਹਿਬ ਸੰਦੀਆ ਕਿਆ ਚਲਹਿ ਤਿਸੁ ਨਾਲਿ ॥
ਇਕਿ ਜਾਗੰਦੇ ਨਾ ਲਹਨਿ ਇਕਨਾ ਸੁਤਿਆ ਦੇਇ ਉਠਾਲਿ ॥੧੧੩॥

۱۱۳

داتی صاحب سندیا کیا چلے تس نال
اک جاگندے نالہنِ اِکنا سُتیا دےء اُٹھال (حضرت بابا نانک)

داتیں = انعامات، دین / تِس = اُس کے / لہن = لیتے ہیں / اُٹھال = اُٹھا کر۔

انعامات (صرف) خدا کی دین ہیں بھلا (بندے کا) کیا زور چل سکتا ہے (خدا) کے ساتھ۔ ایک جاگتے بھی رہیں تو کچھ نہیں پاتے اور ایک وہ ہیں کہ (خدا) انہیں سوتے سے اٹھا کر دیتا ہے۔

یہ شلوک جو بابا نانک کا ہے بابا فرید کے پچھلے شلوک سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے، جس میں کہا گیا تھا کہ ساری ساری رات جاگنے والے، یعنی سخت ریاضت کرنے والے، ہی کچھ پھل پاتے ہیں۔ لیکن بابا نانک کے مزاج میں نرمی زیادہ ہے۔ وہ خدا کی بے نیازی اور بغیر وجہِ ظاہر کے غافل بندوں پر مہربانی کا مژدہ بھی سناتے ہیں۔ فرید اور نانک کی طبائع کا یہ فرق کچھ دوسرے شلوکوں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ فرید ایک نام نہاد سُہاگن کو جھڑک کر سخت طنزیہ لہجے میں کہتے ہیں: "پرواتڑی نہ پچھ ای دھن سُہاگن ناؤں"! (شلوک ۳۱)۔ لیکن نانک اسی مایوس سہاگن کی ہمت یہ کہہ کر بندھاتے ہیں کہ خاوند سے تعلق تو کبھی ٹوٹ سکتا ہی نہیں؛ اس لیے اسے اپنے بے پرواہ خاوند کی توجہ کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور کبھی نہ کبھی ملے گا: "نانک سوہاگنی جو بھاوے بے پرواہ" (۳۲)۔ پھر شلوک ۱۱۹ میں فرید "پری ملن" کے لیے اپنے تن کو تنور اور ہڈیوں کو چوبِ سوختنی کر کے جلاتے ہیں اور پَیر تھک کر رہ جاتے ہیں تو سر کے بل چلنے کا ارادہ کرتے ہیں، لیکن نانک کہتے ہیں کہ اپنے آپ کے ساتھ اتنی سختی روا نہ رکھو، صرف اپنے اندر دیکھو، وہ پیارا وہاں بے مشقت ملے گا (۱۲۰) طبائع کا یہ فرق بنیادی اور جبلی معلوم ہوتا ہے۔ بابا فرید کی طبیعت میں ایک ایذا پسندی ہے جو وہ خود اپنے اُوپر "تلیاں کھونڈن کانگ" (۹۰) کی حد تک روا بلکہ واجب رکھتے ہیں۔ یہی سختی بعض اوقات دوسروں سے بات کرتے وقت اُن میں اُبھر آتی ہے۔ لیکن بابا نانک نسبتاً آزاد طبع ہیں۔ وہ تربیتِ نفس میں ایک حد سے زیادہ سختی پسند نہیں کرتے؛ نہ دوسروں پر نہ اپنے آپ پر۔ وہ کبھی کبھی کی آزاد روی کو صحت مند سمجھتے ہیں۔ اقبال انہی کی ترجمانی کرتا ہے جب وہ کہتا ہے:

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ਢੂਢੇਦੀਏ ਸੁਹਾਗ ਕੂ ਤਉ ਤਨਿ ਕਾਈ ਕੋਰ ॥
ਜਿਨ੍ਹਾ ਨਾਉ ਸੁਹਾਗਣੀ ਤਿਨਾ ਝਾਕ ਨ ਹੋਰ ॥੧੧੪॥

۱۱۴

ڈھوڈھیدیے سُہاگ کُو تئو تن کائی کور
جِنا ناؤ سُہاگنی تِنا جھاک نَ ہور

ڈھونڈیندیئے = اے ڈھونڈنے والی / تَو = تیرے / تن = یہاں تن سے مراد بدن اور رُوح دونوں ہیں۔ لہذا "تَو تَن" کے معنی "تیری ذات" ہوگا / کائی = کوئی / کور = کمی، عیب / ناؤں = نام۔ "نام" بعض دفعہ حقیقت سے تضاد ظاہر کرتا ہے لیکن بعض اوقات خود حقیقت کے معنی دیتا ہے۔ یہاں دوسری صورت ہے / جھاک = اُمید۔

اَے سُہاگ ڈھونڈنے والی! (تو اگر اپنی تلاش میں ناکام ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) تیری ہی ذات میں کوئی عیب ہے۔ سہاگنی جن کا نام ہے وہ (سوائے رب کے) کسی اور سے اُمید ہی نہیں لگاتیں۔

خدا کی معرفت ڈھونڈنے والے اپنی تلاش میں کئی وجہ سے ناکام رہتے ہیں۔ اُن میں سے فرید نے یہاں ایک ایسی وجہ کا انکشاف کیا ہے جو اکثر تلاش کرنے والوں کے دل کا چور ہوتی ہے اور تحت الشعور رہتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کے دل میں رب کی چاہ کے ساتھ ساتھ اور چاہتیں بھی ہوتی ہیں۔ انھیں اللّٰہ سے تو اپنے عُقدوں کے حل کی اُمید ہوتی ہے لیکن ساتھ ساتھ وہ غیر اللّٰہ سے بھی کچھ مخفی امیدیں باندھ لیتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا شرک ہے جسے شرکِ خفی کہنا چاہیے۔
شلوک کی سلاست، روانی اور محاکمانہ انداز نے مل کر اسے بہت مؤثر بنا دیا ہے۔

ਸਬਰ ਮੰਝਿ ਕਮਾਣ ਏ ਸਬਰੁ ਕਾ ਨੀਹਣੋ ॥
ਸਬਰ ਸੰਦਾ ਬਾਣੁ ਖਾਲਕੁ ਖਤਾ ਨ ਕਰੀ ॥੧੧੫॥

115

صبر مَنّجھ کماݨ اے صبرُ کا نِیہݨو
صبر سندا باݨُ خالقُ خطا نَ کری

منجھ = بیچ، میں / نیہنو = کمان کا چلّہ / سندا = (پنجابی) دا، کا / کری = کرے (؟) کرتا (؟)۔
صبر میں کمان ہے (یعنی صبر کمان ہے) اور صبر کا چلّہ ہے اور صبر ہی تیر ہے۔ خدا (ایسے تیر کو) خطا نہیں جانے دیتا۔
صبر میں کمان ہے سے مُراد ہے کہ صبر خود کمان ہے، پھر صبر ہی وہ چلّہ یا ڈوری ہے جس سے تیر پھینکا جاتا ہے اور صبر ہی تیر ہے۔ جب کسی شخص کے لیے صبر ہی کمان، چلّہ اور تیر بن جائے (یعنی اس کی زندگی کے سب کام انتہائی صبر کے ساتھ ہوں) تو وہ جو تیر بھی پھینکے گا توفیقِ خداوندی سے وہ نشانے پر لگے گا۔ ویسے بھی یہ ایک تجربے کی بات ہے کہ صبر سے بہت عُقدے حل ہوتے ہیں۔ دنیاوی معاملات میں صبر کرنے والے کی مخالفت کم ہوتی ہے۔ اور جب کوئی دوسروں کے اختلاف کو صبر سے برداشت کرنے کی عادت ہی بنا لے تو لوگ اس کی مخالفت چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح اس کے مشن کی کامیابی کے موقعے بڑھ جاتے ہیں۔
ایک بات جو اس شلوک میں محلِ نظر ہے وہ یہ ہے کہ تیر کمان مدافعت کا نہیں بلکہ حملے کا ہتھیار ہے ؛ اسے صبر کا سمبل بنانا جو کہ اپنی ذات میں مدافعت ہے ذرا عجیب لگتا ہے۔ تاہم اگر صبر کو دنیاوی معاملات سے الگ کر کے روحانی دائرے میں لے جایئں تو وہاں وہ انسان کی عرش پر یلغاروں کا سمبل بن سکتا ہے۔ ہمارے کئی شاعروں نے خدا کو شکار کرنے کی بات کی ہے۔ اقبال کہتا ہے : در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ!
(جبریل کیا شے ہے ؛ اے انسان خدا پر کمند ڈال!)
بطور ہتھیار کمند تیر سے دُور نہیں ؛ دونوں کا مقصد شکار ہے۔ اگلے شلوک میں جو "خدا سے نزدیک ہونے" کے بھید کا ذکر آ رہا ہے وہ بھی خدا کے شکار سے زیادہ مختلف نہیں۔

ਸਬਰ ਅੰਦਰਿ ਸਾਬਰੀ ਤਨੁ ਏਵੈ ਜਾਲੇਨਿ ॥
ਹੋਨਿ ਨਜੀਕਿ ਖੁਦਾਇ ਦੈ ਭੇਤੁ ਨ ਕਿਸੈ ਦੇਨਿ ॥੧੧੬॥

116

صبر اندرِ صابری تنُ ایوَے جالینِہ
ہونِ نجیکِ خداءِ دَے بھیتُ نَ کِسے دینِ

صابری = صبر والا، صابر؛ "صابر" ہی کو پنجابی محاورے میں "صابری" کہا جاتا ہے / ایوے = اس طرح / جالیں = جلاتے ہیں / نجیک = نزدیک / بھیت = بھید۔
صابروں کے اندر کا صبر تن کو اس طرح جلاتا ہے۔ وہ خدا کے نزدیک ہوتے ہیں لیکن کسی کو اپنا بھید بتاتے نہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ زندگی کی طرح طرح کی ضروریات کے متعلق صبر کرنے والے موٹے تازے نہیں ہو سکتے ؛ ان کا بدن تو ڈیلا اور "جلا ہوا" ہی ہوگا۔ صوفی روایت یہ ہے کہ صبر کرنے کی عادت انہیں خدا کی معرفت کے نزدیک لے جاتی ہے۔ لیکن وہ اپنا بھید کسی کو نہیں دیتے۔

"بھید نہ کسے دیں" کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ صبر والے خدا سے اپنی نزدیکی کسی پر ظاہر نہیں کرتے، گویا اسے عشق کی طرح چھپاتے ہیں۔ دوسرے یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ کسی کو یہ نہیں بتاتے کہ وہ کس طریق اور تدبیر سے خدا کی نزدیکی میں پہنچے ہیں۔ پہلے معنی بہتر معلوم ہوتے ہیں۔

ایوے (= اس طرح) کا مفہوم سمجھ نہیں آیا۔ "اِس طرح" کچھ نتیجہ یا جواب چاہتا ہے، لیکن شلوک میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

ਸਬਰੁ ਏਹੁ ਸੁਆਉ, ਜੇ ਤੂੰ ਬੰਦਾ ਦਿੜੁ ਕਰਹਿ ॥
ਵਧਿ ਥੀਵਹਿ ਦਰੀਆਉ, ਟੁਟਿ ਨ ਥੀਵਹਿ ਵਾਹੜਾ ॥੧੧੭॥

117

صبرُ ایہُ سُآوُ جے توُں بنّدا دِڑُ کرہِ
ودھِ تھیوہِ دریاؤُ ٹُٹِ نَ تھیوہِ واہڑا

سوآو = زندگی کا نشانہ، نصب العین / جے توُ بندہ = اگر توُ اے بندے ! / دِڑھ = پکّا، پختہ / کرہِ = کرے / ودھ = بڑھ، زیادہ / تھیوہ = ہو جائے گا / ٹُٹ نہ = ممکن ہے یہ دو لفظ نہ ہوں بلکہ ایک ہی لفظ "ٹُٹن" ہو / واہڑا = "واہ" نالہ ہے اور "ڑا" علامتِ تصغیر، لہذا چھوٹا نالہ۔

اے بندے ! صبر وہ نصب العین ہے کہ اگر توُ اسے اپنی رُوح میں جما لے تو توُ بڑھ کر دریا ہو جائے گا اور اگر یہ ٹُوٹ (اُکھڑ) جائے تو توُ چھوٹا نالہ رہ جائے گا۔

صبر کا مضمون پچھلے دو شلوک سے چلا آ رہا ہے۔ بابا فرید کا ہر فرع کی سختیوں پر صابر و شاکر رہنا ان کی زندگی کا ایک امتیازی خاصہ ہے۔ اس لیے اگر وہ صبر کے ایسے نتیجے بیان کریں جو ہمیں مُبالغہ معلوم ہوں تو انھیں غلط نہیں سمجھنا چاہیے۔ وجہ یہ کہ صبر ان کا تجربہ تھا اور ہمیں یہ تجربہ حاصل نہیں۔ اس لیے اگر وہ فرماتے ہیں کہ صبر کا حاصل عُلوِ ہمت ہے جو کسی عظیم دریا کی طرح بے روک ٹوک آگے بڑھتا ہے تو اتنا ہمیں بھی نظر آ ہی رہا ہے کہ ان کی ہمت سے ان کے رشد و ہدایت اور فیض کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور ان کے شلوک لاکھوں کی رُوح کو اہتزاز میں لا رہے ہیں۔ پھر جب علت نہ رہے گی تو معلول بھی نہ رہے گا : صبر نہ ہوگا تو دریا کی آزاد روانی بھی نہ ہوگی۔ اقبال کہتے ہیں :

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے یہ جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

اقبال نے "زندگی" کہا ہے لیکن بابا فرید کی زندگی صبر ہی تھی۔

ਫਰੀਦਾ ਦਰਵੇਸੀ ਗਾਖੜੀ ਚੋਪੜੀ ਪਰੀਤਿ ॥
ਇਕਨਿ ਕਿਨੈ ਚਾਲੀਐ ਦਰਵੇਸਾਵੀ ਰੀਤਿ ॥੧੧੮॥

118

فریدا درویسی گاکھڑی چوپڑی پرِیتِ
اِکنِ کِنےَ چالِیےَ درویساوی رِیتِ

گاکھڑی = کٹھن، مشکل / چوپڑی = چُپڑی، دکھاوے کی / اِکن کِنے = کتنے ایک نے / چالیے = چلائی ہے / درویشاوی = درویشوں والی۔

اے فرید ! اصل درویشی کا طریق کٹھن ہے۔ یہ درویشی (جو عام دیکھنے میں آتی ہے) دکھاوے کی پریت (جیسی) ہے۔ کتنے ایک نے اصل درویشی کی ریت کو چلایا اور نباہا ہے؟ (یعنی بہت تھوڑوں نے)۔

معلوم ہوتا ہے کہ بابا فرید کے زمانے میں بھی جعلی صوفی عام ہو گئے تھے حالانکہ اس زمانے میں اسلام ابھی پنجاب میں نیا نیا آیا تھا۔ ان صوفیوں کا سرمایہ بس لمبے لمبے جُبّے اور ہزار دانہ

تسبیحیں ہوتی تھیں اور وہ لوگوں سے مُفت کے نذرانے وصول کرکے عیش کی زندگی گزارتے تھے۔ امام غزالیؒ کے زمانے (پیدائش - وفات ۴۵۰ھ/۵۰۵ھ) میں بھی یہ جعلساز وبا کی طرح پھیل گئے تھے یہاں تک کہ اُنہیں یہ فتویٰ دینا پڑا کہ ایسے صوفیوں کو، جو اپنے جھوٹے حال اور وجد سے سادہ لوح لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں اور محنت سے اپنی روٹی نہیں کماتے، قتل کرنا واجب ہے۔

ਤਨੁ ਤਪੈ ਤਨੂਰ ਜਿਉ ਬਾਲਣੁ ਹਡ ਬਲੰਨ੍ਹਿ ॥
ਪੈਰੀ ਥਕਾਂ ਸਿਰਿ ਜੁਲਾਂ ਜੇ ਮੂੰ ਪਿਰੀ ਮਿਲੰਨ੍ਹਿ ॥੧੧੯॥ ۱۱۹

تنُ تپےَ تنوُر جیو بالنڑُ ہڈ بلنِ
پیَری تھکاں سِرِ جُلاں جے مُوں پِری مِلنِ

جیوں = جیسے، کی طرح / بالن = ایندھن، سوختنی لکڑی / بلن = جلتے ہیں / جُلاں = چلوں / مُوں پِری = میرا پیارا۔

(میرا) تن تنور کی طرح تپتا ہے اور (میرے) ہاڑ سوختنی لکڑی کی طرح جلتے ہیں۔ (اس کی تلاش میں چلتے چلتے) پاؤں تھک جائیں گے تو میں سر کے بل چلوں گا اگر یُوں ہی میرا پیارا مجھے ملے۔

بابا فرید اپنے محبوب (یعنی رب) کی تلاش میں اس طرح چل رہے ہیں کہ جسم نزار ہے اور ہڈیاں تک دُکھ رہی ہیں۔ اس حالت میں جب پاؤں تھک کر جواب دینے لگتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ اگر پاؤں چلنے سے رہ گئے تو کیا ہوا، میں سر کے بل سفر جاری رکھوں گا۔ تلاش ترک نہیں کروں گا یہاں تک کہ میں اپنے محبوب کو پالوں۔ حصولِ مقصد کے لیے تکلیفیں برداشت کرتے چلے جانا فرید کی طبیعت کا امتیازی وصف ہے۔ یہ اتنا نمایاں ہے کہ جب بابا نانک نے ان کا یہ شلوک دیکھا تو اُن کے دِل نے کہا کہ اتنی سختی برداشت کرنی اپنے آپ پر ظلم ہے چنانچہ اگلے شلوک میں انہوں نے اپنے اس خیال کا اظہار کرکے اسے گرنتھ صاحب میں شامل کرلیا۔

ਤਨੁ ਨ ਤਪਾਇ ਤਨੂਰ ਜਿਉ ਬਾਲਣੁ ਹਡ ਨ ਬਾਲਿ ॥
ਸਿਰਿ ਪੈਰੀ ਕਿਆ ਫੇੜਿਆ ਅੰਦਰਿ ਪਿਰੀ ਨਿਹਾਲਿ ॥੧੨੦॥ ۱۲۰

تنُ نَ تپاءِ تنوُر جیو بالنڑُ ہاڈ نَ بالِ
سِرِ پیَری کیا پھیڑیا اندرِ پِری نِہالِ (حضرت بابا نانک)

پھیڑیا = بگاڑا / پِری = پیارا، محبوب / نِہال = دیکھ

(محبوب کی تلاش میں) اپنے آپ کو تنور کی طرح نہ تپا اور اپنے ہاڑ نہ جلا۔ سر اور پیروں نے کیا قصور کیا ہے (کہ انھیں یُوں دُکھ دیا جائے۔ اس کی بجائے) اپنے اندر ہی نظر ڈال اور محبوب کو دیکھ۔

یہ شلوک بابا نانک کا ہے جو امُور میں اعتدال دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کا موقف ہے کہ انسان کو اپنے ضمیر میں جھانکنے سے بھی خدا کا کشف ہو سکتا ہے۔ (مَنْ عَرَفَ نَفْسَہ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہ حدیث: جس نے اپنا آپ پہچانا، اُس نے خدا کو پہچانا)

ਹਉ ਢੂਢੇਦੀ ਸਜਣਾ ਸਜਣੁ ਮੈਡੇ ਨਾਲਿ ॥ ۱۲۱
ਨਾਨਕ ਅਲਖੁ ਨ ਲਖੀਐ ਗੁਰਮੁਖਿ ਦੇਇ ਦਿਖਾਲਿ ॥੧੨੧॥

ہَو ڈھُوڈھیدی سجنڑاں سجنڑُ میڈے نالِ
نانک اَلکھُ نَ لکھیَے گرُ مُکھِ دےءِ دِکھالِ

Scanned with CamScanner

ہَوں = میں / سجناں = سجن کو / اَلکھ = لکھن مصدر سے بمعنی دیکھنا۔ نفی کے الف کے ساتھ معنی ہوجاتے ہیں "جو نہ دیکھا جا سکے"۔ مُراد خدا۔

میں ڈھونڈتی ہوں سجن (خدا) کو (حالانکہ) سجن میرے ساتھ (میری روح میں) ہے۔ اے نانک اس نظر نہ آنے والے (خدا) کا چہرہ (صرف) گرُو دکھا دیتا ہے۔

یہ شلوک گرو رام داس کا ہے جنھوں نے اپنے رواج کے مطابق اپنے لیے نانک تخلص برتا ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ وہ اپنے لیے مونث کا صیغہ استعمال کرتے ہیں جو ہندی شاعری کی روایت ہے اور جو غالباً بابا فرید کے وقت تک پنجابی میں رائج نہیں ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ بعض شلوکوں میں فرید نے بھی بظاہر مونث کا صیغہ برتا ہے لیکن غور سے دیکھنے پر معلوم ہوگا کہ وہ اپنے لیے نہیں بلکہ کسی واقعی عورت کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ مثلاً اج نہ سُتی کنت سیوں (شلوک ۳۰) کسی سچ مچ کی عورت کا ذکر ہے۔ اپنا حال احوال تو وہ اکثر داڑھی اور پگڑی کے حوالے سے کرتے ہیں جو خاص مردانہ نشانیاں ہیں۔ خدا کا گرُو کے دکھانے سے دیکھا جانا بھی ہندی روایت ہے۔ فرید کہیں بھی کسی مُرشد کی دستگیری کا ذکر نہیں کرتے۔ ہاں اپنی کوششوں اور ان کی ناکامیوں کا مذکور بعض جگہ ہُوا ہے۔ "آپے سو رب نہ بوہڑیو دیکھ بندے دے بھاگ!" (شلوک ۹۰) مُرشد کے وسیلے کی بات کہیں نظر نہیں آتی۔

ਹੰਸਾ ਦੇਖਿ ਤਰੰਦਿਆ ਬਗਾਂ ਭਿ ਆਇਆ ਚਾਉ ॥

ਡੁਬਿ ਮੁਏ ਬਗ ਬਪੁੜੇ ਸਿਰੁ ਤਲਿ ਉਪਰਿ ਪਾਉ ॥੧੨੨॥

۱۲۲

ہنسا دیکھِ ترَندیا بگا آیا چاؤ

ڈُبِ مُئے بگ بَپُڑے سِرُ تلِ اُپرِ پاؤ

ترندیاں = تیرتے ہوئے / بپُڑے = بچارے، بے عقل، کم نصیب / بگ = بگلا / تَل = تلے، نیچے۔

ہنسوں کو تیرتے ہوئے دیکھ کر بگلوں کو (بھی تیرنے کا) چاؤ آیا۔ انجام یہ ہوا کہ وہ بے عقل ڈوب کر مر گئے۔ (ان کی لاشیں اس طرح تیر آئیں کہ) ان کے سر نیچے اور پاؤں اُوپر تھے۔

یہ شلوک گرُو امر داس کا ہے۔ بگلے کا اِستعارہ منافقت، بہروپ اور نااہل کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ہنس اور بگلے میں ایک ظاہری مماثلت ضرور ہے لیکن ہنس اصل ہے اور بگلا نقل۔ ہنس کی خوراک موتی ہے اور بگلا اپنی خوراک کے لیے کیچڑ میں منہ مارتا ہے۔ گرو امر داس کا کہنا یہ ہے کہ جب نااہل لوگ اہل لوگوں کا رُوپ بھرتے ہیں تو وہ ناکام رہتے ہیں۔ شاید گرو صاحب کے ذہن میں وہ کہانی ہو جس میں کوئی نااہل زاہد عابد بابا فرید کو چلّۂ معکوس کرتے دیکھ کر خود بھی پاؤں اُوپر اور سر نیچا کر کے اُلٹا لٹک گیا تھا لیکن جلد ہی ہمت ہار کر چلّہ درمیان میں چھوڑ گیا تھا۔ یُوں اُس نے اُس بگلے کا نقشہ پیش کیا جو ہنس کی نقل کرتے ہوتے پانی میں ڈوب جاتا ہے اور پھر اس کی لاش سطحِ آب پر اس طرح تیر آتی ہے کہ پاؤں اوپر اور سر نیچا ہوتا ہے۔

ਮੈ ਜਾਨਿਆ ਵਡਹੰਸੁ ਹੈ ਤਾਂ ਮੈ ਕੀਤਾ ਸੰਗੁ ॥

ਜੇ ਜਾਣਾ ਬਗੁ ਬਪੁੜਾ ਜਨਮਿ ਨ ਭੇੜੀ ਅੰਗੁ ॥੧੨੩॥

۱۲۳

مَے جانیا وڈ ہنس ہے تاں مَے کیتا سنگُ

جے جاݨا بگُ بپُڑا جنمِ نَ بھیڑی انگُ

سنگ = ساتھ، رفاقت / جنم = زندگی بھر، ساری عمر / نہ بھیڑی = نہ بھڑاتا، نہ چھوتا / انگ = اعضائے بدن، بدن۔

میں اسے ہنس سمجھا تب میں نے اس کا ساتھ کیا۔ اگر میں یہ جانتا کہ وہ (دراصل) بگلا ہے تو ساری عمر اس کو نہ چھوتا۔

یہ شلوک بھی گرُو امر داس کا ہے اور پچھلے شلوک میں برتے گئے استعارے ہی میں بات کرتا ہے۔ ناجنس کی صُحبت میں جو کسی حساس آدمی کو تکلیف ہوتی ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے گرو امر داس کہتے ہیں کہ میں نے مغالطے میں ایک ناجنس کو اپنا رفیق بنا لیا۔ اگر اس کا پہلے سے پتا ہوتا تو میں کبھی بھی اُس کی رفاقت کا دم نہ بھرتا۔

ਕਿਆ ਹੰਸੁ ਕਿਆ ਬਗੁਲਾ ਜਾ ਕਉ ਨਦਰਿ ਧਰੇ ॥
ਜੇ ਤਿਸੁ ਭਾਵੈ ਨਾਨਕਾ ਕਾਗਹੁ ਹੰਸੁ ਕਰੇ ॥੧੨੪॥

۱۲۴

کیا ہنسُ کیا بَگُلا جا کئو ندرِ دھرے
جے تِسُ بھاوَے نانکا کاگہُ ہنسُ کرے

جاں کئو = جس کو / ندر = نظر / نظر کو ندر لکھنا غالباً پہلے گورمکھی کاتب کا سہو ہے۔

اے نانک! کیا ہنس اور کیا بگلا، خدا جس پر بھی نظرِ مہر ڈالے اور جو بھی اسے بھا جائے پھر چاہے وہ کوا ہی کیوں نہ ہو، وہ اسے ہنس بنا دیتا ہے۔

یہ شلوک گرو نانک کا ہے۔ وہ کوے کی مثال دے کر فرماتے ہیں کہ اگر خدا کسی پر مہربان ہو تو پھر چاہے وہ بُرے سے بُرا آدمی بھی ہو نیک بن جاتا ہے۔

ਸਰਵਰ ਪੰਖੀ ਹੇਕੜੋ ਫਾਹੀਵਾਲ ਪਚਾਸ ॥
ਇਹੁ ਤਨੁ ਲਹਰੀ ਗਡੁ ਥਿਆ ਸਚੇ ਤੇਰੀ ਆਸ ॥੧੨੫॥

۱۲۵

سروَر پنکھی ہیکڑو پھاہیوال پچاس
ایہُ تنُ لہری گڈُ تھیا سچے تیری آس

سَروَر = جھیل / پنکھی = وہ مسافر پرندے جو جھیلوں اور نالابوں پر اُتر کر بسیرا کرتے ہیں اور جن کا بکثرت شکار کیا جاتا ہے / گڈ تھیا = پھنس گیا / سچے = رب سچے، خدا
پھاہی وال = جال لگانے والے شکاری۔

جھیل کی سطح پر پرندہ اکیلا ہے اور اس اکیلے شکار کیلئے پچاس شکاری گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ تن (پرندہ) جھیل کی لہروں میں پھنس چکا ہے۔ اے سب سچے اب تیری ہی آس ہے (کہ تو اسے طوفانی لہروں اور شکاریوں سے بچائے گا)۔

اس شلوک میں پرندے سے مراد انسانی فرد ہے جسے اُس کے دنیاوی سفر میں سینکڑوں مُہلک ترغیبات اپنی طرف کھینچ رہی ہیں اور اتنے ہی خوف اس کے سیدھی راہ پر چلنے میں حائل ہیں۔ حالت یہ ہو گئی ہے کہ دنیاوی زندگی کے بے شمار رشتوں میں سے کوئی اسے اِدھر اور کوئی اُدھر کھینچ رہا ہے اور اس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔ اس صورتِ احوال میں انسان کو سوائے خدا کی مدد کے کوئی اور طاقت ہلاکت سے نہیں بچا سکتی۔ چنانچہ وہ اسے ہی اپنی مدد کے لیے پکارتا ہے: "سچے تیری آس!" یہ شلوک انسان کی ناتوانی اور اس کے گرد و پیش کی معاشرتی بندھنوں (پھاہی وال) اور طبعی طاقتوں (آبی لہریں) کی زور آوری کا نہایت اچھا نقشہ ہے۔ ایک طرف شکاری، دوسری طرف امواجِ آب اور ان میں گھرا ہوا کمزور انسان انگریزی ضرب المثل Between the Devil & the deep Sea. کی تصویر اور تفسیر ہیں۔ زبان سادہ اور سلیس ہے جو اس شلوک کو فرید کے بہترین کلام میں شامل کرتی ہیں۔

ਕਵਣੁ ਸੁ ਅਖਰੁ ਕਵਣੁ ਗੁਣੁ ਕਵਣੁ ਸੁ ਮਣੀਆ ਮੰਤੁ ॥
ਕਵਣੁ ਸੁ ਵੇਸੋ ਹਉ ਕਰੀ ਜਿਤੁ ਵਸਿ ਆਵੈ ਕੰਤੁ ॥੧੨੬॥

۱۲۶

کوَنُ س اکھرُ کوَنُ گنُ کوَنُ سُ منِیا منّتُ
کوَنُ سُ ویسو ہئو کری جِتُ وسِ آوے کنّتُ

کَون سو = کَونسا / اکھر = حرف ، لفظ ، وِرد / کون سو اکھر = کونسا حرف ۔ بعض شارح "سو" کو "اکھر" سے ملاکر اس کے معنی " اچھا حرف " بتلاتے ہیں لیکن ہم نے پہلے معنوں کو ترجیح دی ہے / مَینا = جواہر، رتن / منت = منتر، وِرد / مَنیامنت = ہیرے جیسا قیمتی منتر / ہَوں کری = مَیں کروں / دیسو = بھیس ، لباس / جِت = جس سے / وس آوے = بس میں آئے / کنت = محبوب ۔

وہ کونسا حرف ہے ، وہ کونسی خوبی ہے ، وہ ہیرے جیسا قیمتی منتر کونسا ہے اور وہ لباس کونسا ہے جسے میں پہنوں تو محبوب میرے بس میں آجائے ۔

جب کسی محبوب کے چاہنے والے بطریقِ راست اسے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتے تو نئی نئی وضع کے لباسوں ، اندازوں ، تعویذوں اور منتروں سے اسے رام کرنے منصوبے سوچتے ہیں ۔ فرید نے کئی جگہ بندے کے خدا سے نہ مل سکنے کی کم نصیبی کا ذکر کیا ہے ۔ جب اُن کو سخت ریاضت سے بھی ، جو خدا تک پہنچنے کی سیدھی راہ ہے ، کچھ ہاتھ نہ آیا تو اُن کے ذہن میں عملیات کا خیال پیدا ہوا ۔ مگر یہ خیال مدِ خیال سے آگے نہیں بڑھتا ۔ آگے وہ پوچھتے ہیں کونسا گُن اور کونسا منتر محبوب کو رجھا سکے گا تو اُن کا یہ استفہام دراصل استفہام انکاری ہے ۔ انھیں پہلے سے ہی پتا ہے کہ عملیات سے انسانی تقدیر بدل نہیں سکتی اور محرومی اس کا نصیبہ ہو چکا ہے ۔

ਨਿਵਣੁ ਸੁ ਅਖਰੁ ਖਵਣੁ ਗੁਣੁ ਜਿਹਬਾ ਮਣੀਆ ਮੰਤੁ ॥
ਏ ਤ੍ਰੈ ਭੈਣੇ ਵੇਸ ਕਰਿ ਤਾ ਵਸਿ ਆਵੀ ਕੰਤੁ ॥੧੨੭॥ ١٢٧

نِوَنُ سُ اکھرُ کھوَنُ گُنُ جِہبا مَنِّیا منّتُ
اے ترَے بھَینے ویس کرِ تا وس آوِی کنّتُ (حضرت گرُو نانک)

نِوَن = نیوناں (پنجابی) ، خاکساری ، عاجزی ، عجز / کھوَن = درگزر ، معاف کر دینا ، عَفو / جِہبا = جیبھ ، زبان ، لیکن یہاں مُراد ہے میٹھی زبان ، میٹھا بول / بھَینے = اے بہن ! / ویس کر = انھیں اپنا لباس بناؤ ۔

(کنت کو بس میں لانے کے لیے جو حرف ، گُن اور منتر درکار ہے) وہ حرف حرفِ عجز ہے ، وہ گُن دوسروں کے گناہوں کے معاف کر دینے کا گُن ہے اور وہ اتم منتر میٹھے بول کا منتر ہے ۔ اے بہن ان تین صفتوں کو تو اپنا لباس بنالے تو کنت تیرے بس میں آجائے گا ۔

یہ شلوک گرو نانک کا ہے جو انہوں نے فرید کے پچھلے شلوک کے جواب میں لکھا ہے ۔ فرید کا "سوال" تھا کہ کیا کروں ، کیا کہوں اور کیا انداز اختیار کروں کہ کنت میرا ہو جائے ۔ جواب سے ظاہر ہے کہ یہاں کنت سے مراد خدا کی ذات ہے کیونکہ دنیا کے محبوبوں کو خاکساری اور عَفو جیسے گُنوں سے کچھ ایسی دلچسپی نہیں ہوتی ۔ البتہ یہ گُن یا صفات الہامی کتابوں کے مطابق خدا کی رضامندی کا ذریعہ ہیں مثلاً قرآن شریف ہی میں (۱) عباد الرحمن یمشون علی الارض ہونا (۲) عافین عن الناس اور (۳) قولوا للناس حُسنا کو سراہا گیا ہے ۔ بابا نانک کا جواب بہت خوب ہے ۔ لیکن ہمارا اپنا خیال یہی ہے کہ فرید نے دراصل کوئی سوال نہیں کیا تھا ۔ وہ اپنی ناکامیوں کے احساس اور درد کو ، جو اضطراری کیفیت اختیار کر گیا ہے ، کیا کروں ، کہاں جاؤں کہہ کہہ کر بیان کرنے کی کوشش کر رہے ۔ اُن کا استفہام محض فارم کا استفہام ہے ، معنے کا نہیں ، جو یہ ہے کہ کچھ بھی تو نہیں ہوگا اور کنت کبھی بھی ادھر نگاہ نہیں ڈالے گا ۔ فرید سوال نہیں کر رہا ، فریاد کر رہا ہے ۔ تاہم بابا نانک کا شلوک اپنی جگہ بہت خوب اور پند آموز ہے ۔

ਮਤਿ ਹੋਦੀ ਹੋਇ ਇਆਣਾ ॥ ਤਾਣ ਹੋਦੇ ਹੋਇ ਨਿਤਾਣਾ ॥
ਅਣਹੋਦੇ ਆਪੁ ਵੰਡਾਏ ॥ ਕੋਈ ਐਸਾ ਭਗਤੁ ਸਦਾਏ ॥੧੨੮॥ ١٢٨

مَتِ ہودی ہوءِ ایانا تانُ ہودے ہوءِ نِتانا
اَنْ ہودے آپُ ونڈائے کو ایسا بھگتُ سدائے

اپانا = انجان/تان = توان (فارسی) ، زور ، طاقت / نتانا = ناتوان ، کمزور/ اَن ہوندے = نہ ہوتے ہوئے / ونڈائے = بٹوائے ، بانٹ لے/بھگت = درویش ، اللہ لوک۔

(جو شخص) علم وعقل رکھتے ہوئے بھی انجان ہو ؛ توانائی رکھتے ہوئے بھی ناتواں ہو اور (مال واسباب کی کمی کے باوجود دوسروں سے) اپنے تھوڑے کو بانٹ لے ، کوئی ایسا شخص ہی اللہ والا کہلا سکتا ہے ۔

"جانتے ہوئے نہ جاننے" کا اطلاق متعدد دائروں میں ہوسکتا ہے ۔ اخلاق کے دائرے میں تو یہ ہوگا کہ آپ دوسروں کے عیب جانتے ہوئے بھی انھیں نہ جانیں یعنی عیب پوشی کریں ۔ علم کے دائرے میں اس کا اطلاق یہ ہوگا کہ زیادہ سے زیادہ علم کے باوجود یہ حقیقت سامنے رہے کہ انسانی علم بہت محدود ہے اور اس کا آخری حاصل یہ ہے کہ ع "جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی" ۔ طاقت رکھتے ہوئے ناتواں ہونا یہ ہے کہ باوجود قوت اور قدرت کے کسی کا حق نہ چھینے اور کسی پر زبردستی اپنے اعتقادات مسلط نہ کرے ۔ پھر جب حاجت مند لوگ اس کے پاس اپنی حاجت لے کر آئیں تو اُن کی حاجت روائی کرے چاہے خود تنگی میں ہو ۔ ایسی خصلتوں والا انسان ہی درویش کہلانے کا مستحق ہے ورنہ کمبل پہننے اور گلے میں منکے لٹکانے سے کوئی درویش نہیں بن جاتا ۔

ਇਕੁ ਫਿਕਾ ਨਾ ਗਾਲਾਇ ਸਭਨਾ ਮੈ ਸਚਾ ਧਣੀ ॥

ਹਿਆਉ ਨ ਕੈਹੀ ਠਾਹਿ ਮਾਣਕ ਸਭ ਅਮੋਲਵੇ ॥੧੨੯॥ ۱۲۹

اِکُ پھکا نا گالائے سبھنا مَے سچا دھنیٔ

ہیاؤ نَ کیہی ٹھاہِ مانک سبھ اموَلوے

پِھکا = پھیکا ، رُوکھا ، بے مُروّت/گالائیں = گالھ کرنی (پنجابی) ، بات کرنی / سچّا دھنی = سچّا مالک ، خدا/ ہیاوَ = دل / کیہں = کوئی / ٹھاہیں = ڈھائیں (پنجابی)/ مانک = موتی / امولویں = انمول ۔

(کسی سے) ایک لفظ بھی رُوکھا نہ بولنا کیونکہ سب میں سچّا رب بستا ہے ۔ کسی کا بھی دل نہ توڑنا کیونکہ یہ (دِل) ایسے موتی ہیں جن کا کوئی مول نہیں ۔

معنی صاف ہیں ۔ کسی تشریح کی ضرورت نہیں ۔

ਸਭਨਾ ਮਨ ਮਾਣਿਕ ਠਾਹਣੁ ਮੂਲਿ ਮਚਾਂਗਵਾ ॥

ਜੇ ਤਉ ਪਿਰੀਆ ਦੀ ਸਿਕ ਹਿਆਉ ਨ ਠਾਹੇ ਕਹੀਦਾ॥੧੩੦॥ ۱۳۰

سبھناں من مانک ، ٹھاہن مُول مچانگوا

جے توَ پِریا دی سک ہیاؤ نہ ٹھاہیں کہیں دا

مُول = بالکل / مچانگوا = چنگا نہیں ، اچھا نہیں / پِریا = محبوب ، خدا / سِک = آرزو ، تانگھ / ہیاوَ = دِل / ٹھاہیں = ڈھائیں (پنجابی) ، توڑنا / کہیں دا = کسی کا ۔

سب کا دِل موتی ہے جس کا توڑنا ذرا بھی اچھا نہیں (یعنی بہت بُرا ہے) ۔ اگر تو اپنے محبوب (سے ملنے) کی آرزو رکھتا ہے تو کسی کا دِل نہ توڑنا ۔

معنی صاف ہیں کسی تشریح کی حاجت نہیں ۔ بعض مؤلفوں کے اُردو رسم الخط میں لکھے ہوئے شلوک میں "مانک" کی بجائے "نانک" درج ہوا ہے جو صحیح نہیں ۔

آسا بانی، پہلی

۱

ਦਿਲਹੁ ਮੁਹਬਤਿ ਜਿੰਨ੍ ਸੇਈ ਸਚਿਆ ॥	دِلو محبت جنہہ سے ای سچے آ
ਜਿਨ੍ ਮਨਿ ਹੋਰੁ ਮੁਖਿ ਹੋਰਿ ਸਿ ਕਾਂਢੇ ਕਚਿਆ ॥੧॥	جن من ہور، مکھ ہور، سے کانڈھے کچے آ
ਰਤੇ ਇਸਕ ਖੁਦਾਇ ਰੰਗਿ ਦੀਦਾਰ ਕੇ ॥	رتے عِشق خداءِ رنگ دِیدار کے
ਵਿਸਰਿਆ ਜਿਨ੍ ਨਾਮੁ ਤੇ ਭੁਇ ਭਾਰ ਥੀਏ ।੧।	وسریا جن نام تے بھوئیں بھار تھیئے

۲

ਆਪਿ ਲੀਏ ਲੜਿ ਲਾਇ ਦਰਿ ਦਰਵੇਸ ਸੇ ॥	آپ لئے لڑ لاءِ در درویش سے
ਤਿਨ੍ ਧੰਨੁ ਜਣੇਦੀ ਮਾਉ ਆਏ ਸਫਲੁ ਸੇ ॥੨॥	تِن دھن جنیندی ماؤ آئے سپھل سے

۳

ਪਰਵਦਗਾਰ ਅਪਾਰ ਅਗਮ ਬੇਅੰਤ ਤੂ ॥	پرودگار، اَپار، اَگم، بےانت توں
ਜਿਨਾ੍ ਪਛਾਤਾ ਸਚੁ ਚੁੰਮਾ ਪੈਰ ਮੂੰ ॥੩॥	جنھاں پچھاتا سچ چُما پیر مُوں

۴

ਤੇਰੀ ਪਨਹ ਖੁਦਾਇ ਤੂੰ ਬਖਸੰਦਗੀ ॥	تیری پنَہ خداءِ توں بخشندگی
ਸੇਖ ਫਰੀਦੈ ਖੈਰੁ ਦੀਜੈ ਬੰਦਗੀ ॥੪॥੧॥	شیخ فریدے خیرُ دیجے، بندگی!

۱ جنھہ = جنہیں / سے ای = سیٔ، وہی / آ = ہا، ہیں / کانڈھے = کہلاتے ہیں / کچے = ناپُختہ، وہ جو ابھی راہِ سلوک میں منزل تک نہیں پہنچے / رتے = رنگے / رنگ دیدار کے = (دیدار کا رنگ یعنی چہ ؟ سمجھ نہیں آیا) / وسریا = بھُولا، یہاں اس کے معنی وساریا (بھُلایا) زیادہ مناسب لگتا ہے / بھوئیں = زمین پر / بھار تھیئے = بوجھ بن گئے۔

۲ آپ = یہاں غالباً مُراد ہے خدا سے / لڑلاءِ = اپنے لڑسے باندھ لیا۔ اپنے لیے چُن لیا / در درویش = معنے واضح نہیں لیکن غالباً مراد ہے درگاہ و درویش یا درویشی / سے = معنی واضح نہیں غالباً وہ۔ لیکن اگر یہ ہندی لفظ ہے تو حرفِ جار ہوگا۔/ جنیندی = جننے والی / سپھل = پھل والا، کامیاب / دھن = قابلِ مبارکباد۔

۳ پرودگار = یہ لفظ پروردگار کا پنجابی تلفظ ہے۔ ویسے بھی یہاں پروردگار کہنے سے مصرع بے وزن ہو جاتا ہے / اپار = جس کا کوئی "پار اُرار" نہ ہو، ورا الورئے / اگم = پہنچ سے باہر / بے انت = جس کا انت نہ ہو، ابتدا انتہا نہ ہو؛ لامحدود / سچ = حق۔ حضرتِ حق / مُوں = میں۔

۴ پَنَہ = پناہ، حفاظت / بخشندگی = اگر یہ لفظ پہلے مصرعے کے مضمون کو ختم کرتا ہے تو اس کے معنی ہوں گے "بخشش مجسم" یعنی بخشن ہار۔ لیکن اگر اسے اگلے مصرعے سے پیوستہ سمجھا جائے تو اس کے معنی صرف "بخشش" ہوں گے۔/ فریدے = فرید کو / خیر = خیرات، بھیک / بندگی = اگر یہ لفظ پچھلے الفاظ سے وابستہ ہے تو اس کے معنی ہوں گے غلامی یا عبودیت، لیکن اگر یہ الگ ہے تو اس کے معنی ہوں گے "سلام" یا "سلام رخصت" کیونکہ فریدؒ یہاں اپنی بات ختم کر رہا ہے۔

۱ جن کی محبت دل سے ہے (حقیقیؔ) وہی سچے ہیں۔ لیکن جن کے دل میں کچھ اور ہے اور منہ پر کچھ اور، وہ کچے کہلاتے ہیں (یعنی ابھی ناپختہ ہیں)۔ (پہلے وہ ہیں جنہیں) عشق نے خدا کے رنگ میں رنگ دیا ہے (ان کے برعکس) جنھوں نے خدا کا نام بھلا دیا ہے وہ زمین کا بوجھ بن کر رہ گئے ہیں۔

دوسرا مصرع وزن سے بہت دور چلا گیا ہے اور کسی صورت درست نہیں پڑھا جاسکتا لیکن پہلے مصرعے کی صحیح خواندگی کے لیے "جنہ" کے آخری حرف کو متحرک پڑھا جاسکتا ہے اور یہ ہمارے خیال میں تحریف بھی نہیں ہوگی۔ تیسرے مصرعے میں یہ پتا نہیں چلتا کہ "رنگ" کا لفظ خدا سے تعلق رکھتا ہے یا دیدار سے۔ مگر یہ دیکھتے ہوئے کہ "دیدار کا رنگ" کوئی معنی نہیں رکھتا "رتے عشق خداء رنگ" قابلِ ترجیح معلوم ہوتا ہے جس کے معنی ہوں گے "جنھیں عشق نے خدا کے رنگ میں رنگ دیا ہے" لیکن پھر "دیدار کے" کا ٹکڑا بے جوڑ رہ جاتا ہے اور ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ پہلے مصرعے کے معنی مبہم ہی رہتے ہیں۔

دوسرے مصرعے میں مذکور لوگوں کو "کچے" کہنے میں ایک نکتہ ہے۔ سیدھی بات تو یہ ہوتی کہ انہیں منافق کہہ دیا جاتا، لیکن انہیں راہِ سلوک میں ناپختہ کہا گیا ہے۔ آدمی پختہ ہو جائے تو اس کا ظاہر اس کے باطن سے "اور" ہو ہی نہیں سکتا؛ ان کا اختلاف ناپختگی کا نشان ہے۔ تاہم چونکہ ناپختہ کا پختہ ہو جانا ممکن ہے اس لیے امید کی ایک جھلک یہاں دکھائی دے جاتی ہے۔

۲ (خدا نے خود اس شخص کو) اپنے لڑ لگا لیا کہ وہ درِ درویش پر تھا۔ اُسے جننے والی ماں دھن ہے کہ وہ کامیاب ہے۔

اس شبد کے معنی باعتبارِ نحو صاف نہیں۔ بظاہر سبھی شارحین نے اٹکل سے مطلب نکال کر کچھ یُوں ہی کہہ دیا ہے۔ پہلے مصرعے میں "آپے لڑلاء" اور "در درویش سے" کا نحوی تعلق ہاتھ نہیں آتا۔ ویسے اٹکل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہا جا رہا ہو کہ جو درویشی کی دہلیز پر تھا اُسے خدا نے چُن لیا۔ پھر خود اس جملے کے یعنی "در درویش سے" کے معنی بہت مُبہم ہیں۔ نہیں پتا لگتا کہ آیا کسی ایسے کو چنا گیا ہے جو کسی درویش کی دہلیز پر بیٹھا تھا یا خود در درویش کو؟ دوسرے مصرعے میں "تن دھن جنیندی ماؤ" شاید "دھن تن جنیندی ماؤ" ہوگا۔ مگر یقین نہیں کہ قدیم پنجابی نحو میں لفظوں کی ایسی ادلا بدلی روا بھی جاتی ہو۔ اسی طرح "آئے سپھل" بھی خلافِ محاورہ دکھائی دیتا ہے۔ مروج محاورہ تو پھل ہونا اور سپھل ہونے ہے۔

۳ (اے خدا) تو پالنہار، ورا اورے، پرے سے باہر اور لامحدود ہے۔ جنھوں نے سچائی (حق یا حضرتِ حق) کو پہچانا (وہ اس قابل ہیں کہ میں ادب سے) ان کے پاؤں چوم لوں۔

۴ اس بیت کے معنی دو طرح کیے جاسکتے ہیں:

(۱) اے خدا میں تیری پناہ کا طالب ہوں کہ تو بخشش مجسم ہے۔ شیخ فرید کو خیرات میں اپنی بندگی عنایت کر۔

(۲) اے خدا میں تیری پناہ کا طالب ہوں، تو اپنی بخشندگی (بخشش) شیخ فریدؔ کو خیرات میں دے۔ و اب میری بندگی! (یعنی سلام)۔

یہ چار بیت جو آسا کے عنوان کے تحت گرنتھ صاحب میں جمع کیے گئے ہیں، سوائے آخری دو کے مضمون کی کوئی وحدت یا تسلسل نہیں رکھتے۔ راگ آسا وقت کے اعتبار سے شروع صبح اور مزاج کے اعتبار سے عبادت کا راگ ہے۔

پہلے شبد کے دوسرے مصرعے کا وزن صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ منظوم کلام کو کسی خاص راگ کا پابند کرنا غالباً گرنتھ صاحب کی تدوین کرنے والوں کا کام ہے۔ ہمیں توقع نہیں کہ یہ پابندی بابا فریدؔ نے خود عائد کی ہو۔

آسابانی، دوسری

ਬੋਲੈ ਸੇਖ ਫਰੀਦੁ ਪਿਆਰੇ ਅਲਹ ਲਗੇ ॥
ਇਹੁ ਤਨੁ ਹੋਸੀ ਖਾਕ ਨਿਮਾਣੀ ਗੋਰ ਘਰੇ ॥
ਆਜੁ ਮਿਲਾਵਾ ਸੇਖ ਫਰੀਦ
ਟਾਕਿਮ ਕੂੰਜੜੀਆ ਮਨਹੁ ਮਚਿੰਦੜੀਆ ॥੧॥

١
بولے شیخ فرید پیارے اللہ لگے
ایہ تن ہوسی خاک نمانی گور گھرے
اجّ مِلاوا شیخ فرید
ٹاکم کونجڑیا منوں منچندڑیا

ਜੇ ਜਾਣਾ ਮਰਿ ਜਾਈਐ ਘੁਮਿ ਨਾ ਆਈਐ ॥
ਝੂਠੀ ਦੁਨੀਆ ਲਗਿ ਨ ਆਪੁ ਵਞਾਈਐ ॥੨॥

٢
جے جانا مر جائیے، گھُم نہ آئیے
جھُوٹھی دنیا لگ نہ آپ ونجائیے

ਬੋਲੀਐ ਸਚੁ ਧਰਮੁ ਝੂਠੁ ਨ ਬੋਲੀਐ ॥
ਜੋ ਗੁਰੁ ਦਸੈ ਵਾਟ ਮੁਰੀਦਾ ਜੋਲੀਐ ॥੩॥

٣
بولیے سچُ دھرمُ، جھوٹھُ نہ بولیے
جو گرُ دسے واٹ مُریداں جولیے

ਛੈਲ ਲੰਘੰਦੇ ਪਾਰਿ ਗੋਰੀ ਮਨੁ ਧੀਰਿਆ ॥
ਕੰਚਨ ਵੰਨੇ ਪਾਸੇ ਕਲਵਤਿ ਚੀਰਿਆ ॥੪॥

٤
چھَیل لنگھنّدے پار گوری منُ دِھیریا
کنچن ونے پاسے کلوت چِیریا

ਸੇਖ ਹੈਯਾਤੀ ਜਗਿ ਨ ਕੋਈ ਥਿਰੁ ਰਹਿਆ ॥
ਜਿਸੁ ਆਸਣਿ ਹਮ ਬੈਠੇ ਕੇਤੇ ਬੈਸਿ ਗਇਆ ॥੫॥

٥
شیخ حَیاتی جگ نہ کوئی تھِرُ رہیا
جس آسن ہم بیٹھے کیتے بَیس گیا

ਕਤਕਿ ਕੂੰਜਾਂ ਚੇਤਿ ਡਉ ਸਾਵਣਿ ਬਿਜੁਲੀਆਂ ॥
ਸੀਆਲੇ ਸੋਹੰਦੀਆਂ ਪਿਰ ਗਲਿ ਬਾਹੜੀਆਂ ॥੬॥

٦
کتک کُونجاں، چیتِ ڈوَنھ، ساوَنِ بجلیاں
سِیالے سوہندیاں پِر گلِ باہڑیاں

ਚਲੇ ਚਲਣਹਾਰ ਵਿਚਾਰਾ ਲੇਇ ਮਨੋ ॥
ਗੰਢੇਦਿਆਂ ਛਿਅ ਮਾਹ ਤੁੜੰਦਿਆ ਹਿਕੁ ਖਿਨੋ ॥੭॥

٧
چلے چلنہار وِچاراں لےَ منوں
گنڈھیندیاں چھِئہ ماہ تُڑنّدیاں ہِک کھِنو

ਜਿਮੀ ਪੁਛੈ ਅਸਮਾਨ ਫਰੀਦਾ ਖੇਵਟ ਕਿੰਨਿ ਗਏ ॥
ਜਾਲਣ ਗੋਰਾ ਨਾਲਿ ਉਲਾਮੇ ਜੀਅ ਸਹੇ ॥੮॥

۸
زِمی ، پُچھے اسمان فریدا کھیوٹ کِن گئے
جالن گوراں نال اُلاہمے جِیا سہے

۱ بولے = کہتاہے / اللہ لگے = اللہ سے لگو / نِمانی = بچاری - اس لفظ کا تعلق پچھلے لفظ خاک سے بھی ہو سکتاہے اور اگلے گور سے بھی - تاہم فریدؒ نے چونکہ شلوک ۹۳ میں گور نمانی سڈکرے لکھاہے اس لیے شاید بعض لوگ دوسری صورت کو ترجیح دیں - / اج = اسی زندگی میں / ٹھاکم = یَں روکوں ، قابو میں رکھوں / کونجڑیاں = کونجیں ، جو نفسانی خواہش کی علامتیں ہیں / منوں = من کو / منوں مچندڑیاں = من کو مچلانے والی ، جذبات بھڑکانے والی -

۲ بے جاݨا = اس کا ترجمہ "اگر جانتا" ہو سکتاہے ، جیسے شلوک ۴ اور ۵ میں ہے - لیکن بعض شارحین نے اس کے معنی "جب تُو جانتاہے" لکھے ہیں / ونجائیے = گنوائیے ، ضائع کیجئے -

۳ بولیے سچ دھرم = معنی صاف نہیں - بولیے سچ تو ہو سکتاہے لیکن بولیے سچ دھرم یعنی سچ / واٹ = راستہ / مُریداں = مُریدوں کی طرح / جو لیے = چلیے -

۴ چھَیل = بانکے جواں ، جواں ہمت / گوری = عورت ، کمزور شخص / دھریا = حوصلہ پکڑا / کنچن = سونا ، بال دنیا / کنچن ونے پاسے = بال دنیا کی طرف / کلوت چیریا = وہ آرے سے چیرا گیا ، مبتلائے عذاب ہوا -

۵ حیاتی جگ = حیاتِ دنیا / تھِر = قائم ، ہمیشہ قائم / آسن = استھان ، جگہ / کیتے = کئی ، کتنے ہی / بَیس = بیٹھ -

۶ کتک = کارتک کا مہینہ جو اکتوبر نومبر میں آتاہے / چیت = یہ مہینہ مارچ اپریل میں آتاہے / دَومَھ = جنگل کی آگ - مراد غالباً بہار کے پھولوں کی بُہتات اور اُن کے رنگ سے ہے / سیالے = سردی کے موسم میں / سوہندیاں = اچھی لگتی ہیں / پِیر گل = پیارے کے گلے میں / باہڑیاں = باہیں -

۷ وچاراں = سوچیں ، حسرتیں / گنڈھیندیاں = جُڑتے ، عُضو عُضو بنتے / ترُٹندیاں = ٹوٹنے میں / گِھنو = پل -

۸ زمین پُچھے اسمان = یہاں واضح نہیں کہ زمین پوچھ رہی ہے آسمان سے یا آسمان پوچھ رہاہے زمین / کھیوٹ = کشتی کھینے والے - ملاّح - قوموں اور ملکوں کے لیڈر / کِن = کِتنے ، بعض شارح کِدھر / جالن = برداشت کرنا / اُلاہمے = اُلمنے ، طعنے / جیا = جان -

۱ شیخ فریدؒ کہتاہے کہ اے عزیز اللہ سے لگ جا (لَو لگا) ، کیونکہ تیرا یہ تن مٹی ہو جائے گا اور یہ بچاری (حقیر) قبر تیرا گھر ہو گی - شیخ فریدؒ ! (خدا سے) آج ہی (یعنی اسی زندگی میں) میل ہو سکتاہے بشرطیکہ کونجڑیوں (خواہشاتِ نفسانی) کو روکوں جو من کو مچلانے والی (بھڑکانے والی) ہیں -

۲ اگر یہ یقین ہو کہ آخر کار مر جاناہے اور پھر یہاں واپس نہیں آنا تو اس دلفریب دنیا کے پیچھے لگ کر اپنے آپ کو نہ گنوا (برباد نہ کر) -

۳ اپنے ایمان سے سچ بولیے ، جھوٹ ہرگز نہ بولیے - جو راستہ مُرشد بتائے اس پر مُریدوں کی طرح چلیے -

۴ چھیلے (جواں ہمت سالک) پار گزر جاتے ہیں (خوف اور لالچ کے دریا سے) تو عورتوں جیسے کم ہمت بھی ہمت پکڑتے ہیں - سونے چاندی کی طرف راغب لوگ آرے سے چیرے گئے (ٹُکڑا ٹُکڑا)

۵ اے شیخ فرید ! حیاتِ دنیا میں کوئی ہمیشہ قائم نہیں رہا - جس استھان پر ہم بیٹھے ہیں اس پر کئی بیٹھ چکے ہیں -

۶ کارتک کے مہینے میں کونجیں آتی ہیں ، چیت کے مہینے میں جنگلوں میں (پھولوں کی کثرت سے گویا) آگ لگی ہوتی ہے ، ساون کے مہینے میں بجلیوں کی چمک آنکھیں چکاچوند کرتی ہے اور سردیوں میں محبوب کے گلے میں باہیں پڑی ہوئی بھلی لگتی ہیں -

۷ چلنے والا چلا ، دل میں سوچیں (حسرتیں) لیے ہوئے - جسے بننے میں چھ مہینے لگے تھے اُسے ٹوٹنے میں صرف ایک پل لگا -

۸ اے فریدؒ ، آسمان زمین سے پوچھتاہے کہ ملاّح (دنیا کے بڑے بڑے راہنما ، بادشاہ اور امرا) کِدھر گئے - زمین جواب میں بتاتی ہے کہ وہ قبروں نال (قبروں میں) گزر کر رہے ہیں اور اُن

کی روحیں الزام سہہ رہی ہیں۔ مُراد یہ حساب کتاب اور جواب طلبیوں کے عذاب سہہ رہے ہیں۔

آسا کے اس "قطعے" میں بھی بیتوں کے موضوعات الگ الگ ہی ہیں اور اُن کا کوئی تسلسل (منطقی یا جذباتی) نہیں پایا جاتا۔ مختلف موضوعات ناپائیداریِ دُنیا و اسبابِ دُنیا، عبرت اور وعظ و نصیحت ہیں۔ چھٹا بیت البتہ مستثنیٰ ہے کہ وہ ایک خالص جمالیاتی کیفیت بیان کرتا ہے جس میں نہ عبرت ہے نہ پند۔ قریباً آدھے مصرعے ایسے ہیں کہ اُن کا وزن محلِ نظر ہے لیکن شاید جہاں راگ کو اتنی زیادہ اہمیت ہو کہ وہ عنوان بن جائے وہاں نظمی وزن پر کم توجہ دی جاتی ہو۔

راگ سُوہی

۱

تپ تپ ، لُوہ لُوہ ، ہاتھ مروڑوں
باول ہوئی سو شَوہ لوڑوں
تیں شَوہ من میں کیا روس
مجھ اوگن شَوہ ناہیں دوس
تیَں صاحب کی مَیں سار نہ جانی
جوبنُ کھوءِ پاچھے پچھوتانی

ਤਪਿ ਤਪਿ ਲੁਹਿ ਲੁਹਿ ਹਾਥ ਮਰੋਰਉ ॥
ਬਾਵਲਿ ਹੋਈ ਸੋ ਸਹੁ ਲੋਰਉ ॥
ਤੈ ਸਹਿ ਮਨ ਮਹਿ ਕੀਆ ਰੋਸੁ ॥
ਮੁਝੁ ਅਵਗਨ ਸਹਿ ਨਾਹੀ ਦੋਸੁ ॥੧॥
ਤੈ ਸਾਹਿਬ ਕੀ ਮੈ ਸਾਰ ਨ ਜਾਨੀ ॥
ਜੋਬਨੁ ਖੋਇ ਪਾਛੈ ਪਛੁਤਾਨੀ ॥੧॥

۲

کالی کوئل توُں کِت گنُ کالی
اپنے پریتم کی ہَوں برہے جالی
پرِہ بِہوُں کِتھ سُکھ پائے
جاں ہوءِ کرپال تاں پربھو ملائے

ਕਾਲੀ ਕੋਇਲ ਤੂ ਕਿਤ ਗੁਨ ਕਾਲੀ ॥
ਅਪਨੇ ਪ੍ਰੀਤਮ ਕੇ ਹਉ ਬਿਰਹੈ ਜਾਲੀ ॥
ਪਿਰਹਿ ਬਿਹੂਨ ਕਤਹਿ ਸੁਖੁ ਪਾਏ ॥
ਜਾ ਹੋਇ ਕ੍ਰਿਪਾਲੁ ਤਾ ਪ੍ਰਭੂ ਮਿਲਾਏ ॥੨॥

۳

وِدھن کھوُہی مُندھ اکیلی
نہ کو ساتھی نہ کو بیلی
کر کِرپا پربھ سادھ سنگ میلی
جاں پھرِ دیکھا تا میرا اللہُ بیلی

ਵਿਧਣ ਖੂਹੀ ਮੁੰਧ ਇਕੇਲੀ ॥
ਨਾ ਕੋ ਸਾਥੀ ਨਾ ਕੋ ਬੇਲੀ ॥
ਕਰਿ ਕਿਰਪਾ ਪ੍ਰਭਿ ਸਾਧ ਸੰਗਿ ਮੇਲੀ ॥
ਜਾ ਫਿਰਿ ਦੇਖਾ ਤਾ ਮੇਰਾ ਅਲਹੁ ਬੇਲੀ ॥੩॥

۴

ਵਾਟ ਹਮਾਰੀ ਖਰੀ ਉਡੀਣੀ ॥	واٹ ہماری کھری اُڈینی
ਖੰਨਿਅਹੁ ਤਿਖੀ ਬਹੁਤੁ ਪਿਈਣੀ ॥	کھینوں تِکھی بہت پیئینی
ਉਸੁ ਊਪਰਿ ਹੈ ਮਾਰਗੁ ਮੇਰਾ ॥	اُس اُوپر ہے مارگ میرا
ਸੇਖ ਫਰੀਦਾ ਪੰਥੁ ਸਮ੍ਹਾਰਿ ਸਵੇਰਾ ॥੪॥	شیخ فریدا پنتھ سمار سویرا

۱ تپ تپ = جل جل کر / لُوہ لُوہ = ترپ تڑپ کر / باول = باولی، دیوانی / ڈھوڈو = ڈھونڈتی ہوں / من = دِل / روس = روٹھنا، غصہ / مُجھ = مجھ میں / سار = قدر۔

۲ ہَوں = میں / جالی = جلائی ہوئی / پِرے = پیارے / بِہُوں = بغیر / کرپال = مہربان / پربھو = خدا۔

۳ وِدھن = خوفناک، سنسان / کھُوہی = کُواں، نشیب جگہ، وادی / مُندھ = عورت، جوان عورت / کرپا = مہربانی / سادھ سنگ = حلقۂ درویشاں، درویشوں کا ساتھ / میلی = ملائی۔

۴ واٹ = راستہ / کھری = بہت / اُڈینی = دُکھ بھری / کھنیوں = کھنڈے سے زیادہ، تلوار سے زیادہ / پیئینی = تیز / مارگ = راستہ، طریق / پنتھ = راستہ / سمار = سنبھال۔

۱ مَیں پچھتاوے میں جل جل اور تڑپ تڑپ کر ہاتھ مروڑتی ہوں اور باولی سی ہوکر محبوب کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ اے میرے مالک محبوب! تیرے دل میں میری طرف سے کیا ناراضگی ہے؟ (میں مانتی ہُوں) مجھ میں عیب ہیں، تیرے اوپر کوئی ذمّہ نہیں۔ (یہ میں ہوں جس نے) اے مالک تیری قدر نہ پہچانی (اب جوانی کا) وقت گزر جانے کے پیچھے پچھتا رہی ہوں۔

۲ (جیسے باورے کیا کرتے ہیں) میں کالی کوئل سے پوچھتی ہوں کہ تو کیوں سیاہ ہے؟ (وہ جواب دیتی ہے کہ) میں اپنے محبوب کے فراق میں جل کر سیاہ ہوگئی ہُوں۔ سچ ہے محبوب کے بغیر بھلا کہاں سکھ پایا جاسکتا ہے۔ ہاں جب وہی مہربان ہوگا تو اس سے میل ہوگا۔

۳ (میں اس طرح ہوں جیسے) کسی سنسان بھیانک وادی میں اکیلی عورت ہو جس کا کوئی ساتھی ہو نہ بیلی۔ پھر وہ یکا یک دیکھے کہ اللّٰہ میرا مددگار ہے اور اُس نے کرم کرکے مجھے رفیقِ سفر (محبوب) سے مِلا دیا ہے۔

۴ اب ہمارے آگے جو راستہ ہے وہ بڑا کٹھن ہے (اس میں ہلاکت کا ایسا خطرہ ہے گویا وہ راستہ نہیں بلکہ) وہ کوئی تلوار سے تیکھی اور تیز شے ہے۔ اسی راستے پر چلنا اب ہمارا طریق ہوگا۔ اس لیے اے فرید علی الصبح ہی اس راہ پر چل پڑو۔

آسا کی دو پچھلی نظموں کے برعکس اس نظم میں ایک ربط موجود ہے اگرچہ وہ کہیں صاف ہے اور کہیں مدھم۔ راگ سوہی کی اس داستان فراق و وصال میں جذبات عمیق اور بلند ہیں اور ان کے بہاؤ کی رفتار تیز اور کم آوا ہے۔

یہاں ایک ہجراں زدہ عورت ہے جس کی کسی غلطی سے اس کا محبوب رُوٹھ کر کہیں چلا گیا ہے اور وہ غم اور پچھتاوے میں دیوانگی کی سرحدوں کو چھو رہی ہے اور ہر کس و ناکس سے بہکے بہکے سوال کر رہی ہے۔ وہ کالی کوئل سے، جو اسے اپنے جیسی دُکھیاری نظر آئی ہے پوچھتی ہے کہ تم کیوں اس طرح سوختہ تن ہو، تو اُسے جواب ملتا ہے کہ ساتھی کے بچھوڑے نے میرا یہ حال کر دیا ہے۔ پھر وہ ہجراں نصیب اِن ہم گفتاروں کے حلقے سے نکل کر یکہ و تنہا اپنے محبوب کی تلاش میں چل نکلتی ہے۔ لق و دق بیابانوں اور سنسان وادیوں میں اس کی وحشت گردی پر ترس کھا کر خدا اس کے محبوب کے دِل کو اس کی طرف پھیر دیتا ہے اور وہ اس سے آن ملتا ہے۔ پھر وہ اُس سفر پر اکٹھے چل پڑتے ہیں جس پر عشاق ہمیشہ چلتے آئے ہیں۔

اس نظم کے معنی متعدد سطحوں پر سمجھے جا سکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو اسے مجاز کی واردات سمجھ لیں اور چاہیں تو حقیقت کی۔

راگ سُوہی لَلِت

۱
بیڑا بندھِ نہ سکیوں بندھن کی ویلا
بھر سرورُ جب اُچھلے تب ترن دُہیلا
ہتھ نہ لائِ کسنبڑے جل جاسی ڈھولا!

ਬੇੜਾ ਬੰਧਿ ਨਾ ਸਕਿਓ, ਬੰਧਨ ਕੀ ਵੇਲਾ॥
ਭਰਿ ਸਰਵਰੁ ਜਬ ਊਛਲੈ, ਤਬੁ ਤਰਣੁ ਦੁਹੇਲਾ ॥੧॥
ਹਥੁ ਨ ਲਾਇ ਕਸੁੰਭੜੈ, ਜਲਿ ਜਾਸੀ ਢੋਲਾ ॥੧॥

۲
اِک آپی نے پت لی شوہ کیرے بولا
ددھا تھنی نہ آویئی پھر ہوئے نہ میلا

ਇਕ ਆਪੀਨੈ ਪਤਲੀ, ਸਹ ਕੇ ਰੇ ਬੋਲਾ॥
ਦੁਧਾਥਣੀ ਨ ਆਵਈ, ਫਿਰਿ ਹੋਇ ਨ ਮੇਲਾ ॥੨॥

۳
کہے فریدُ سہیلیو شوہ الاسی
ہنس چلسی ڈُمنا ایہہ تن ڈھیری ہوسی

ਕਹੈ ਫਰੀਦੁ ਸਹੇਲੀਹੋ, ਸਹੁ ਅਲਾਏਸੀ ॥
ਹੰਸੁ ਚਲਸੀ ਡੁੰਮਣਾ, ਅਹਿ ਤਨੁ ਢੇਰੀ ਥੀਸੀ ॥੩॥

۱ بیڑا بندھنا = ملاحوں کا عمارتی لکڑی کے بڑے بڑے تختوں یا درختوں کے کٹے ہوئے تنوں کو اکٹھا کرکے دریا میں ڈالنا اور باندھنا تاکہ انہیں دُور و دراز منزلوں تک پہنچایا جا سکے۔ ملاح اِنہی پر ہفتوں سفر کرتے ہیں / بندھ نہ سکنا = اگر دریا طغیانی میں ہو تو اُس کی تیز لہروں کے درمیان تختوں کا باندھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے / سرورُ بھر اُچھلنا = سرور جھیل کو کہتے ہیں، لیکن جھیل میں طغیانی نہیں آتی، نیز بابا فریدؒ کے علاقے میں کوئی جھیل تھی بھی نہیں۔ اس لیے سرور یہاں جھیل نہیں بلکہ دریا ہوگا۔ پلاٹس کی لُغت میں اس کے ایک معنی دریا بھی درج ہوئے ہیں / دہیلا = مشکل / کسنبڑا = ایک پودا جس کا پھول جلد مُرجھا جاتا ہے۔ اس سے ایک رنگ بھی نکالا جاتا ہے جو کچا ہوتا ہے۔ شعر میں اسے اسبابِ دنیا کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ اس کا رنگ اور خوبصورتی عارضی ہوتی ہے / ویلا = وقت۔

۲ تھنی = تھن میں / میلا = میل۔

۳ الائسی = سدسی (پنجابی)؛ بُلائے گا / ڈُمنا = روتے چلاتے (ریتیل)

۱ تو بیڑی (کے تختوں) کو باندھ نہ سکا جب اُن کے باندھنے کا وقت تھا۔ جب دریا (طغیانی میں) بھر کر (کناروں سے) اُچھلنے لگے گا اُس وقت بیڑی کا تیرانا مشکل ہوگا۔ تیسرے مصرعے کے معنی دو طرح کیے جا سکتے ہیں۔ (۱) اے میرے پیارے دوست! کسنبڑے (اسبابِ دنیا) کو ہاتھ نہ لگا، یہ تیرا ہاتھ لگتے ہی جل جائے گا۔ (مُرجھا جائے گا)۔ یعنی تو دیکھ لے گا کہ اس میں پائیداری نہیں ہے (۲) اسباب دنیا کو ہاتھ نہ لگا، تیرا ہاتھ جل جائے گا۔ یعنی اس سے تو روحانی طور پر نقصان اٹھائے گا۔

۲ ایک وہ ہیں جنہوں نے اپنی عزت رکھ لی اور مالک کا ہر کہنا مانا۔ جس طرح تھن میں سے دودھ نکل کر دوبارہ اس کے اندر داخل نہیں ہو سکتا، اسی طرح روح دوبارہ جسم میں داخل نہیں ہوگی۔ (یعنی پھر نہ زندگی ہوگی نہ نیک عمل کرنے کا موقع ملے گا)۔ نہ پہلے مصرعے کے کوئی معنی ہاتھ آتے ہیں، نہ اس کا کوئی تعلق دوسرے مصرعے سے نظر آتا ہے۔

۴ فرید کہتا ہے : اے سہیلیو تمہیں مالک ایک دن اپنے پاس بلائے گا، اور جب وہ بُلائے گا تو تمہاری رُوحیں (ہنس) طوعاً و کرہاً اُدھر چل پڑیں گی اور تمہارے جسم مٹی کی ڈھیری کی طرح یہاں پڑے رہیں گے۔

شوہی بلت کی اس نظم میں سات مصرعے ہیں لیکن ان میں کوئی معنوی ربط نظر نہیں آتا اور آخری مصرعے کا وزن بھی محلِ نظر ہے۔

قاری کے لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ پنجاب میں ریل کے آنے سے پہلے حمل و نقل کا بڑا ذریعہ اس کے دریا ہوتے تھے۔ اسی لیے پنجابی شعر و ادب میں دریا، طوفان اور کشتی وغیرہ کا ذکر بکثرت ملتا ہے اور زبان کے کئی محاورے بھی دریاؤں اور کشتیوں سے متعلق نظر آتے ہیں مثلاً بیڑا کپرّ دات، بیڑا غرق اور بیڑیاں وٹے وغیرہ وغیرہ۔

ضمیمہ

ابیاتِ فریدؒ

جو

گرنتھ صاحب میں موجود نہیں[1]

[1] ان فی الجملہ مشکوک ابیات کا ماخذ پیارا سنگھ پدم اور محمد آصف خاں کی تحریریں ہیں۔ کچھ زبانی بھی سُنے ہیں۔

اٹھ فریدا سُتیا جھاڑو دے مسیت
تُوں سُتا رب جاگدا ، تیری ڈاڈھے نال پریت

اَج کہ کل کہ چوتھے دیہیں ، ہِک اساڈی ہیر
کِیں جِتا کِیں ہاریو ، سودا ایہی ڈیر

اُچا نہ کر سد فریدا ، رب دِلاں دیاں جاندا
جے تدھ وِچ کلب ، سو مجھا ہوں دُور کر

اساں تساڈی بھنو آٹھو پہر سمال
ڈیہوں وسو منے مَنہہ ، راتیں سپنے نال

آسرا دھنی منجھاہ ، کوہِ نہ لاہو کدھ توں
دے ایوں کاج ہتھاہ ، وریلنے سچا دھنی

اکناں مت خداءِ دی ، اِکناں منگ لئی
اک دِتی مول نہ گھندے ، (جیوں) پتھر بوند پئی

اِک وہاجیں توں فریدا ، بیا کستوری جھنگ چڑے
باہر لاءِ صبون ، اندر چھپا نہ تھیوے

اِکے تاں ہکن ہک ، اِکے تاں پچھ سکنیاں
تنہاں پچھے نہ ہک جو ہکن سار نہ جانئی

اِکے تاں لوڑ معدی ، اِکے تاں اقد لوڑ
دونہہ بیڑی نہ لت دھر ونجیں دکھر بوڑ

آدو لدھو ساتھڑو ، ایویں ونج کریں
مول سنبھالیں آپنا ، پاچھے لاہا لیں

ایہہ جو جنگل ڈکھڑے ہریل پت تہناں
پوتھا لکھیا ارتھ دا ایکس ایکس مانہہ

ایہہ مسجدیں ابوتھیاں ، رکھیاں رب سوار
جاں جاں ایس جہاں منہہ ، تاں تاں ڈیکھیں جار

بڈھا تھیا شیخ فرید ، کنبن لگے ٹاہل
ٹنڈڑیاں جل لانیاں ، ٹٹن لگی ماہل

جِت تن برہا اُپجے تِت تن کیسا ماس
اِت تن ایہہ بھی بہت ہے : ہاڈ چام اُد ماس

پریتم ! تم مت جانیا تم بچھرت ہم چین
دادھے بن کی لاکڑی سُلگت ہوں دِن رَین

پِری وسارن بیار دَن کُ بدھ چوین
کچھن راس وسار کر ، مُٹھی ڈھوڑ بھرین

پِیرِیں بیڑا ٹھیلہ کے ، کنڈھیں کھڑا نہ رو
وت نہ آون تھیسیا ، اَیت نہ نیندڑی سو

پَیرِیں کنڈھے پَندھڑا سیتی نُبھانا
بھٹھ ہنڈوے دا پینگھنا ، سیتی اجانا

تکل کاسہ کاٹھ دا واسا وِچ وناں
باریں اندر جالنا درویشاں تے ہرناں

تن رہیا ، من پھٹیا ، طاقت رہی نہ کاۓ
اٹھ پری ، طبیب تھیو ، کاری دارُو لاۓ

تن سُمند ، منسا لہر ، ار تارُو تریں انیک
تے برہی کیوں جیوتے جو آہ نہ کرتے ایک

تُوں تُوں کریندے جو موۓ ، موۓ بھی تُوں تُوں کرن
جینیں تُوں تُوں نہ کیا ، تینہیں نہ سِنجاتو تن
سائیں سندے نادکھے ، دایم پری چوَن
رب نہ بھنے پوریا ، سندے فقیرن

نبھی مارن گاکھڑی ، سدھراں لکھ کرین
جیناں دامن دھراپیا ، سے مانک بیھیں

ٹوپی لَیندے باورے ، دیندے کھرے نلج
چوہا کھُڈ نہ ماو ای ، پچھے بندھیے چھج

جاگنا ای تاں جاگ فریدا ، راتڑی ہبھ ودھانیاں
جے مُوں متھے بھاگ ، پری وسارن نہ کرن

جاگنا ای تاں جاگ فریدا ، ہوئی آ ای پربھات
اس جاگن نوں پچھتائیں گا ، گھنا سویں گا رات

جاں جاں جیویں دُنی تے ، تاں تاں پھر اکھ
درگاہ سچا تاں تھیویں ، جاں کپھن مُول نہ رکھ

جاں مُوں لگا نینہہ تاں میں دُکھ وہاجیا
جُھراں ہبھو ہی ڈینہہ کارن سپے ما پری

جِتی خوشیاں کِیتیاں ، تِتی تھییئے روگ
چھلوں کارن ماریئے ، کھادے دا کیا ہوگ

جتا ! سے راتیں وڈیاں ، ڈُو ڈُو گانڈھنیاں
تم اک جال نہ سنگھیاں، اساں سبھے جالنیاں

جنگل ڈھونڈیں سنگھنا ، لے لُڑیا نہ وت
تن حجرہ درگاہ دا ، تِس وِچ جھاتی گھت

جیں در لگے نینہہ فریدا سو در ناہیں چھڈنا
آ پوے بھانویں مینہہ سِر ہی اُپر جھلنا

جے توں دل درویش فریدا رکھ عقیدہ ساہنا
درہیں سیتی دیکھ ، متھا موڑ نہ کنڈ دے

جے توں وینجیں حج ، حج ہبھو ہی جیا میں
لاہ دے دِی لج ، سچا حاجی تاں تھیویں

جے جے جیویں دنی تے ، کھرپے کہیں نہ لاءِ
اِکو کھیتھن رکھ کے ، ہور سبھو دیہہ لٹاءِ

چُوڑیلی سیوں رتیا دنیا کُوڑا بھیت
ایہنیں اکھیں دیکھدیاں اُجڑ وینجے کھیت

داڑھیاں لکھ وتن فریدا ہبھہ نہ ہکو جیہیاں
اک در لکھ لہن ، ہک لکھوں کنوں ہولیاں

در بھیڑا ، گھر سنکڑا ، گور نواہوں رنت
دیکھ فریدا جو تھیا ، سو کل چلے رِت

در دسانیاں کانیاں ، رب نہ گھڑیئین
لگن تنہاں منافقاں ، جو کدہیں نہ جانیں

درد نہ وینجم داروئیں ، جے لکھ طبیب لگن
چنگی بھلی تھی بہاں ، جے مُوں پری رلن

دل اندر دریاؤ فریدا ، کنڈھی لگا رکیہ پھرے
ٹُبی مار منجھاہیں ، منجھوں ہی مانگ لیں

دمامہ وجیا مَوت دا ، چڑھیا ملک الموت
گھِن واہے جندری ، ڈھاہن واہے کوٹ
کوٹ ڈھٹھا گڑھ لُٹیا ، ڈیرے پئی کہاہ
جیوندیاں دے ہور راہ ، مویاں دے ایہی راہ

دُنی دے لالچ لگیاں ، محنت بُھل گئی
جاں سِر آئی آپنے ، تاں سبھو وِسر گئی

دیہہ جر جر بھئی فریدا ، نَینیں وہے سریش
سے کوہاں منجھا بھیا ، آنگن تھیا بدیس

راتیں سویں کھٹ فریدا ، ڈینہیں پٹیں پیٹ کوُں
جاں تو کھٹن ویل ، تداہیں تئیں سَوں رہیا

سِکاں سِک سِکندیاں ، سِکیں ڈینہے رات
مینڈیاں سِکاں سبھ پجُن ، جاں پریا پائی جھات

سو در سچا سیو فریدا ، جت مُکلُوبنی جاہِ
رِج متک ہڈ کھوہ ، عمل نہ وکن کہاہ

سے داڑھیاں کوڑاویاں ، جو شیطان بُجھیں
اہرن تلے ودان جیوُں ، دوزخ کھڑ دھریئن

فریدا ایسا ہوءِ رہو ، جیسا گھ مسیت
پیراں تلے لتاڑیئے ، کدے نہ چھوڑیں پریت

سائیں سیویاں کھل گئی ، ماس نہ رہیا دیہہ
تب لگ سائیں سیوساں ، جب لگ ہوسوں کھیہہ

فریدا پاؤں پسار کے ، اٹھے پہر ہی سَوں
لیکھا کوئی نہ پچھ ای ، جے وچوں جاوی ہَوں

فریدا راتیں چار پہر ، ڈُو سُتا ڈُو جاگ
گھنا سووسی گور مَنہہ ، لہیا ایہہ وَیراگ

فریدا ستیاں نیند ، مت پَونڈے ایو
جیہناں نین نندراوے ، دھنی ملندے کیو

فریدا کھیتی اجڑی ، سچے سیوں رو لاءِ
بے ادھ کھادھی ابریں ، تاں پھل بہتیرا پاءِ

فرید کڈیں آہ ہکڑا ، استے ہن بھی تھیسی ہک
اوپئی ٹنا نہ کرے ، تتھی لایوس بِک

فریدا کھیتی اُجڑی ، گِردی پر رہیا مال
صاحب لیکھا منگسی ، بنْدے کون حوال

کدے آہوں ہیکڑا ، استے ہن تھیو پرگٹ
ایوں پاؤ مشاہرو ، جا لاءِ بیٹھوں ہٹ

فرید چلے پردیس کو ، قطب جُو کے بھاؤ
سانپاں جودھاں ناہراں ، تینوں دانت بندھاؤ

کرن حکومت دُنی دی ، حاکم ناوَں دھرنِ
اگے ڈھول پیادیاں ، پچھے کوت چلن
چڑھ چلن سکھ واسنی ، اُپر چوَر چلن
سیج وِچھاون پاہرُو ، جتھے جاءِ سوَن
تیہناں جناں دیاں ڈھیریاں ، دُوروں پئیاں دِسّن

کنّاں ، دنداں ، اکھیاں ، سبھناں دِتی ہار
ویکھ فریدا چھڈ گئے ، ٹدھ قدیمی یار

کنت نینْہہ تن گارڑی ، ناگاں ہاتھ مناءِ
وِس گندلیں مسدہ نگر ، ہورین لَہد لہاؤ

کُوک فریدا کُوک توں ، جیوں راکھا جوار
جب لگ ٹانڈا نہ گرِے ، تب لگ کُوک پکار

کُوکیندڑا تاں کُوک فریدا ، کدے تاں رب سُنیسیا
نِکل وَیسی پھُوک ، تاں پھر کُوک نہ ہوسیا

کیا لڑ چھٹے لٹ فریدا ، تھیں جالی چنج وسنے
جے توں مریں پیٹ ، تاں کیہا تیرا سو پری

لہریں سائر کھیہندیاں ، بھی سو ہنس ترن
کیا ترین بگ بپُڑے جو پہلی لہر ڈُبن

مانک مُول اتھاہ فریدا ، قدر کیہ جانیں شیش گر
اِکے تاں گُوہڑا شاہ ، اِکے تاں جانیں جوہری

ماؤ پَینڈی کملی ، جن "جیوَن" رکھیا ناوَں
جاں دِن پُنّے موَت دے ، نہ جیون نہ ناوَں

مناں ! مُن مُنایاں ، سر مُنّے کیا ہوءِ
کیتی بھیڈاں مُنیّاں ، سرگ نہ لدھی کوءِ

منجھ مکہ منجھ ماڑیاں ، منجھے ہی محراب
منجھے ہی کعبہ تھیا ، کیں دے کری نماز

مُوسیٰ نٹھا موت تے ، ڈھونڈے کائے گلی
چارے کُنڈاں ڈھونڈیاں ، اگے مَوت کھلی

مُوں تن اَوگن اَیترے جِتی اندر وار
ہک نری خواری تھی رہے جے ڈِتن باہر وار



مَیں تن اَوگن اَیترے جیتے دھرتی گھ
تَو جیہا مَیں نہ لہاں ، مَیں جیہیاں کئی لکھ

وچھوڑا بُریار جت وچھڑے تن دُبلا
سے ماہنو ہینیار وچھڑ میٹے جو تھیَن

وڈی ایہہ بہادری ، کر گُننگ کو تیاگ
درگاہ تھیوی مُکھ اُجلا ، کوءِ نہ لگے داغ

ہاتھی سوہن انباریاں ، پچھے کٹک ہزار
جاں سِر آوی آپنے ، تاں کو میت نہ یار

ہے جیا کھڑسی جب ، اتے کیسی س ون جیوں
کیا روسی تب ، جو رہی کوڑا تھیا



یکے از مطبوعات
پیکیجز لمیٹڈ لاہور